Thamama کو *Samama* ہونا چاہیے، اسی طریقے سے بعض اور ناموں کی بھی اصلاح کی ضرورت ہے، گو استناد کے اعتبار سے اس میں بعض کمتر درجہ کی کتابوں کے حوالے ہیں لیکن واقعات سب صحیح ہیں جو مستند کتابوں میں بھی موجود ہیں، اور واقعات کا انتخاب بہت اچھا کیا گیا ہے۔

مناجات مقبول مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مع ترجمہ و شرح مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، تقطیع اوسط، ضخامت ۶۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸؍، پتے دار المصنفین اعظم گڈھ، صدق بک ایجنسی گولہ گنج لکھنؤ، الوزار بک ڈپو امین آباد پارک لکھنؤ۔

مناجات مقبول حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی منتخب و مرتب کردہ قرآنی و حدیثی دعاؤں کا مشہور و مقبول مجموعہ ہے، اس میں دو سو سے اوپر دعائیں ہیں، جو ورد میں سہولت کیلیے سات حزبوں میں تقسیم ہیں، متن کیساتھ پرانے طرز کا اردو ترجمہ بھی تھا اب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے اس میں ترمیم کرکے اسکو زیادہ سلیس اور موجودہ مذاق کے مطابق بنا دیا ہے، اور حاشیہ میں ہر دعا کی ضروری تشریح کر دی ہے، اور اسکے حکم و مصالح اور ان سے متعلق ضروری فوائد و نکات بھی تحریر فرما دیے ہیں جس سے ان دعاؤں کی دلنشینی اور جذب و کشش میں اور اضافہ ہو گیا ہے، یہ مجموعہ ہر مسلمان کے ورد میں رہنے کے لائق ہے۔

ریاض ہاشمی، از جناب محمد شرف الدین صاحب سلیم علوی، تقطیع بڑی ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ بہتر کتابت و طباعت معمولی قیمت ۱۲؍، پتہ:۔ ادبستان بختیار منزل بوزنگ پیٹ، مدراس

مصنف جنوبی ہند کے مشہور شاعر ہیں، ریاض ہاشمی انکی نعتیہ نظموں کا مجموعہ ہے اس میں سو سے اوپر نعتیں ہیں، اور چند حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور خواجہ معین الدین چشتیؒ کی منقبت میں شاعری کی حیثیت سے یہ نظمیں خاصی ہیں، اور ان کے بہت سے متفرق اشعار نہایت پاکیزہ اور بلند ہیں، لیکن مذہبی حیثیت سے خیالات میں بے اعتدالی پائی جاتی ہے، جس سے اس قسم کی نظمیں بہت کم خالی ہوتی ہیں جن لوگوں کو اس قبیل کی نظموں کا ذوق ہو یہ مجموعہ ان کے مطالعہ کے لائق ہے،

"م"

جلد ۶۳ ماہ رجب المرجب ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۴۹ء عدد ۵

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۳۲۲-۳۲۴

مقالات

تدوین قرآن	شاہ معین الدین احمد ندوی	۳۲۵-۳۴۱
عہد اسلامی کا ہندوستان	مولانا سید ریاست علی ندوی	۳۴۲-۳۶۰
اردو زبان کی بناوٹ میں افغانون کا حصہ	جناب مولانا امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانہ ریاست رامپور	۳۶۱-۳۸۰
علامہ شبلیؒ بحیثیت فارسی شاعر کے	جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی علیگ ایڈوکیٹ اعظم گڈھ	۳۸۱-۳۹۲
ہندوستان کے کتب خانے	جناب مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی	۳۹۳-۳۹۸
مطبوعات جدیدہ	"م"	۳۹۹-۴۰۰

شذرات

جمعیۃ العلماء کا اجلاس لکھنؤ اس حیثیت سے بہت اہم تھا کہ اس مین جمعیۃ کے دستور العمل مین ایک بنیادی تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ آیندہ اس کو سیاسیات سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور اس کا دائرۂ عمل مسلمانون کے مذہبی، تعلیمی اور تمدنی کامون تک محدود رہے گا، موجودہ حالات مین یہ فیصلہ نہایت مناسب ہے، جمعیۃ نے جن کامون کو اپنے ذمہ لیا ہے اگر وہ انجام پاجائین تو یہ جمعیۃ کا بھی کارنامہ ہوگا اور اس سے انشاء اللہ مسلمانون کی سیاست بھی درست ہوجائے گی، اذا صلحت صلحت کلہ، لیکن اس کے لیے پوری تنظیم کے ساتھ عملی جدوجہد کی ضرورت ہے، اگرچہ یہ کام بھی مشکلات سے خالی نہین ہے، اسلام مین مذہب کا اور ہندوستان مین سیاست کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بہت سے مذہبی اور تمدنی کامون کی سرحد بھی سیاست سے مل جاتی ہے، اور کانگریس کا ایک طبقہ جماعتی کلچر کے تصور کو بھی فرقہ وارانہ اور متحدہ قومیت کے خلاف سمجھتا ہے، اس لیے جمعیۃ نے جن مصالح کی بنا پر سیاست سے علیحدگی اختیار کی ہے، وہی خطرات تمدنی کامون مین بھی درپیش ہین، اسکا تازہ ثبوت ہمارے صوبہ کے وزیر اعظم کی وہ تقریر ہے جو انھون نے جمعیۃ کے اسی اجلاس مین فرمائی ہے، اس کا وہ حصہ جو مختلف فرقون کے حقوق مین مساوات ان کے تحفظ اور ہندو مسلم اتحاد سے متعلق ہے بہت مناسب ہے، لیکن زبان اور کلچر کے متعلق ان کے خیالات نہایت متضاد اور کانگریس کے اصولون کے سراسر خلاف ہین، یہ تقریر خاصی طویل ہے، اس کے جستہ جستہ فقرے یہ ہین،

"مختلف صوبون کے ہندو مسلمانون کا کلچر ایک ہے، اس ملک کے باشندون کو ایک ہی کلچر اسلاف سے ورثہ مین ملا ہے، اور ان کا طرز زندگی ایک ہے، مسلمان ہندوستان کی تہذیب کو اپنی تہذیب سمجھین کیونکہ اس کی بنیاد قدیم آریائی تہذیب پر نہین ہے، بلکہ اس مین مغلون اور دوسرے مسلمانون کے بھی گہرے اثرات ہین، اس لیے مسلمان مختلف کلچر کا خیال نہ کرین، اس سے قومی وحدت کی تعمیر مین رکاوٹین پیدا ہوتی ہین، مختلف صوبون کی زبانون اور کلچر مین اختلافات ہین لیکن ان کی بنیاد مذہب

پر نہین ہے، اگر مسلمان اپنی امتیازی باتون پر زور دینگے تو اس سے الجھنین پیدا ہونگی، ہم کو گاندھی جی کے اصولون کو یاد رکھنا چاہیے اور آپس مین محبت بڑھانی چاہیے، کسی زبان کو کسی مذہبی گروہ سے وابستہ کرنا غلط ہے، ہندی اور اردو کی تعمیر و ترقی مین ہندو مسلمان دونون نے حصہ لیا ہے، اور ہندی مین اردو بھی داخل ہے اور فارسی کے الفاظ بھی شامل ہین، ہندوستان کی سب چھوٹی چھوٹی زبانین اس مین داخل ہین، لیکن نئے الفاظ سنسکرت سے لیے جائینگے عربی سے نہین، رسم الخط دیوناگری ہوگا کیونکہ وہ بہت آسان سائنٹفک اور صوبہ مین رائج ہے، (الجمعیۃ ۲۲ر اپریل سنہ ۱۹۴۹ء)

درحقیقت سارے ہندوستان کا کلچر کبھی ایک نہین رہا اور نہ اب ہے، جیسا کہ خود تقریر مین بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ مختلف صوبون کی زبانون اور کلچر مین اختلافات ہین، گو وہ ان کے نزدیک بنیادی نہین، جنوبی ہند کی زبانین اور وہان کے ہندوؤن کا کلچر شمالی ہند کے ہندوؤن سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا یہان کے مسلمانون سے، حتی کہ ایک دوسرے کی زبان تک نہین سمجھ سکتے، خود ایک صوبہ کے ہندوؤن کے مختلف طبقون کے کلچر مین بڑا فرق ہے، اسلیے پورے ہندوستان کو ایک کلچر اور ایک تہذیب کا وارث کہنا صحیح نہین ہے،

خالص مذہب سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی کلچر کا وہ حصہ جو مخصوص مذہبی تصورات ملی روایات، نیم مذہبی معاشرتی رسم و رواج سے متعلق ہے، نہ صرف مسلمانون کا ہندوؤن سے بلکہ خود ہندوؤن کے مختلف فرقون اور طبقون کا بڑی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہے، اور بودھ، سناتن دھرم، آریہ سماج، جینی، برہمن، چھتری، ویش اور شودر وغیرہ کے کلچر مین کچھ نہ کچھ اختلاف ہے، کلچر کا یہی وہ حصہ ہے جس کے تحفظ کا کانگریس نے وعدہ کیا ہے، ورنہ اگر ہندوستان کے تمام فرقون کا کلچر بالکل ایک ہوتا تو پھر اسکے تحفظ کے کوئی معنی نہین، اور کلچر کے اس حصہ کو نہ صرف مسلمان بلکہ ہندوستان کا کوئی فرقہ بھی نہین چھوڑ سکتا، کہ اسی پر انکی بنیاد ہے،

لیکن اس امتیازی پہلو کے باوجود عام معاشرت مین ہر صوبہ کے ہندو مسلمانون کا کلچر تقریباً ایک ہے، اور آج بھی شہر کے تعلیم یافتہ طبقہ کی تہذیب و معاشرت مین، خواہ وہ ہندو ہون یا مسلمان، اسی طریقہ سے دیہات کے باشندون کے رہن سہن مین کوئی خاص فرق نہین ہے، یہی وہ کلچر ہے جس کی بنیاد خالص آرین تہذیب پر نہین ہے، بلکہ اس مین مسلمانون کے بھی گہرے اثرات ہین، مسلمان اسی مشترک کلچر کو چاہتے ہین، اسکے علاوہ اور کسی امتیازی بات پر زور نہین دیتے، اسی کلچر نے صدیون تک ہندو مسلمانون کو شیر و شکر رکھا، اسلیے متحدہ قومیت کے دشمن درحقیقت وہ لوگ ہین جو اس مشترک کلچر کو مٹا کر ایک نئے کلچر کو جنم دینا چاہتے ہین، مسلمانون کا تو قریب قریب سارا کلچر ہندوانہ رنگ مین رنگا ہوا ہے، حتی کہ انکے مذہبی رسوم بھی ان سے خالی نہین ہین، انکے کس شعبۂ زندگی مین خالص عربی کلچر رہ گیا ہے جس سے دوئی کی بو آتی ہے، بہتر ہوتا کہ اس خیالی کلچر کی تفصیل بتا دیجاتی،

کر مسلمانون کی اسکا علم تو ہو جاتا، ساتھ ہی ہندوون کو بھی اسکی دعوت دیجاتی مگر ان مین بھی اسکا کوئی وجود نہین ہے،

یہ دعویٰ بالکل بیجا ہے کہ ہندی مین ہندوستان کی تمام چھوٹی چھوٹی زبانین شامل ہین، اور اردو اور فارسی الفاظ بھی اس مین داخل ہین، اردو کا سوال تو بعد مین آتا ہے پہلے دراویڈین اور پنجابی اور بنگالی زبانون کو تو ہندی مین شامل کرلیا جائے، جو اس سے حریفانہ مقابلہ کررہی ہین، لیکن اگر اس دعویٰ کو اس حیثیت سے صحیح بھی مان لیا جائے کہ اردو بھی ہندوستان ہی کی پیدا شدہ اور یہیں کی زبانون سے نکلی ہے، اور منشی جی کو یہ خود تسلیم ہے کہ ہندی اور اردو کی تعمیر و ترقی مین ہندو مسلمان دونون کا حصہ ہے تو پھر اردو کیساتھ اجنبی زبان کا برتاؤ کیون ہے، اس کو بھی کم سے کم ان صوبون مین جہان وہ صدیون سے رائج ہے ہندی کے برابر جگہ دیا جائے، اور اس کے ان الفاظ کو جو زبان کا جزو ہوگئے ہین اور جنھین ہر شخص سمجھتا ہے نکال کر انکی جگہ سنسکرت کے مشکل اور نامانوس الفاظ نہ ٹھونسے جائین، اور اردو کو کم سے کم ہندوستانی رہنے دیا جائے، سنسکرت نہ بنایا جائے، یہ تو بقول گوویند سہائے پارلیمنٹری سکریٹری یو۔ پی پرانی برہمنی ذہنیت ہے کہ زبان بھی ایک خاص طبقہ کی ملک بنجائے اور اس کا سمجھنا عوام کی دسترس سے باہر ہو،

دیوناگری رسم الخط اردو کے مقابلہ مین آسان ضرور ہے لیکن اسکو سائنٹفک اور صوبہ مین رائج کہنا صحیح نہین ہے، دیوناگری کی ایک سہولت کے مقابلہ مین اردو رسم الخط کو ترجیحین حاصل ہین کہ وہ دیوناگری کے مقابلہ مین صوتی اور تحریری لحاظ سے زیادہ مکمل ہے بہت زود نویس ہے اور بہت کم جگہ لیتا ہے، رائج ہونے نہ ہونے کی صورت یہ ہے کہ بہت کم تعلیم یافتہ ہندو مسلمان ایسے نکلین گے جو اردو مین نہ لکھ سکتے ہون، اگر کچھ لوگ اردو نہ لکھ سکتے ہون صرف ہندی لکھ سکتے ہون تو بہتیرے اردو لکھ سکتے ہین اور ہندی نہین لکھ سکتے، پھر حکومت کی پالیسی مین کسی معمولی سہولت یا دشواری کا کیا سوال، کیا وہ کسی معمولی دشواری سے بچنے کے لیے کسی انتظامی معاملہ کو چھوڑ دیتی ہے، آخر آجتک ہندو مسلمان دونون کس طرح اس رسم الخط کو سیکھتے تھے، اور اب یہ دشواری ناقابل حل کیون ہوگئی، کسی زبان کو رسم الخط سے محروم کرنا جسم کو جان سے الگ کرنا ہے، متحدہ قومیت کی تعمیر کا یہ طریقہ نہین ہے، اس کی تعمیر انہی وسائل سے ہوسکتی ہے جنھون نے صدیون تک ہندو مسلمانون کو متحد رکھا، اور وہ اسی پرانے **مشترک کلچر یا عام فہم ہندوستانی زبان کا** رشتہ ہے، گاندھی جی کے اصولون کی تبلیغ کرنے والون کو ہر چیز مین ان کے اصول پیش نظر رکھنا چاہیے اسی مین ہندوستان کی فلاح ہے،

مقالات

تدوین قرآن

از شاہ معین الدین احمد ندوی

دنیا کے کسی مذہب کا کوئی الہامی صحیفہ صحت مین قرآن مجید کا مقابلہ نہین کرسکتا، ان سب مین کچھ نہ کچھ ردوبدل ہوگیا ہے، اور بعض مین تو اتنا تغیر ہوگیا ہے کہ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس مین خدا کا کلام کتنا ہے اور انسانی تصرفات کس قدر ہین، یہ امتیاز صرف کلام مجید کو حاصل ہے کہ چودہ صدیون کے اندر اس مین ادنیٰ تغیر بھی نہین ہوا، وہ جس شکل مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین تھا، بغیر کسی ترمیم کے آج بھی اسی شکل مین ہے، جس کو نہ صرف مسلمان بلکہ دوسرے مذاہب کے علماء و محققین بھی مانتے ہین، لیکن عہد صدیقی مین قرآن کی کتابی تدوین کی روایت سے جس کی تفصیل آیندہ آئے گی، بہت سے مسلمانون کو بھی یہ غلط فہمی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ مین کلام مجید کی ترتیب عمل مین آئی، بلکہ بعض ناواقف تو حضرت عثمانؓ کی جانب اس کو منسوب کرتے ہین، جیسا کہ خطبون مین آپکے نام کے ساتھ "جامع آیات القرآن" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، لیکن یہ دونون باتین غلط فہمی پر مبنی ہین، درحقیقت کلام مجید عہد رسالت ہی مین پورا مرتب[1] ہوچکا تھا، اور اس کی ترتیب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کی ہدایت کے مطابق فرمائی تھی، لیکن کتابی شکل مین نہ تھا، بلکہ اونٹ کی ہڈیون، پتھر کی تختیون، کھجور کی شاخون اور چمڑے کے

[1] ترتیب سے مراد سورتون مین آیتون کی ترتیب یعنی ہر سورہ کی آیتین مرتب اور ہر سورہ اپنی جگہ پر مکمل ہوچکی تھی،

ٹکڑوں پر متفرق طور سے لکھا ہوا تھا، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان تحریروں کو اسی ترتیب کے مطابق جو عہد نبوی میں ہو چکی تھی ایک جگہ جمع کر کے کتابی شکل میں مدون کر دیا، اور حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانہ میں اس کی نقلیں کرا کے مختلف اسلامی ملکوں میں بھجوائیں۔ ان سب کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

عہد صدیقی میں قرآن کی تدوین کی روایت سے مخالفین کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اور بعض نے اس کا اظہار بھی کیا ہے کہ جو کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یادداشت سے مرتب کی گئی ہو اس میں تغیر و تبدل کا امکان ہو سکتا ہے، گو یہ صحیح نہیں ہے لیکن اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ عہد صدیقی کی تدوین بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس قدر جلد اور اتنے اہتمام سے ہوئی کہ اس میں کسی غلطی کا امکان ہی نہیں ہو سکتا تھا، اس مضمون کا مقصد اسی غلط فہمی کا ازالہ ہے۔

کلام مجید کی اہمیت اور اس کی خصوصیات

دنیا کے اور تمام مذاہب اور ان کے پیغمبر مخصوص قوموں اور ملکوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بھیجے گئے، اور ان کی تعلیمات ایک خاص زمانہ تک کے لیے تھیں اسلیے ان کا پیام بھی محدود تھا، لیکن اسلام خدا کا آخری دین ہے اور ابد تک اور سارے عالم کی ہدایت کیلیے آیا تھا، اس لیے قرآن مجید کا پیام ساری دنیا کے لیے اور ابدی ہے، اور وہ تنہا اخلاق و روحانیت کا درس نہیں بلکہ دنیا و آخرت دونوں کی زندگیوں کا پورا دستور العمل ہے، خود قرآن کہتا ہے:-

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا
اور نہیں بھیجا ہم نے تم کو مگر سارے لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا،

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ
کلام مجید سارے عالم کے لیے نصیحت ہے۔

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ
کلام مجید تمام لوگوں کیلیے ہدایت اور ہدایت اور حق و باطل میں فرق کرنے والی کھلی دلیل ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلنَّاسِ
اس کتاب میں کوئی شک و شبہ نہیں اس میں لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔

کلام مجید کی اس اہمیت کی بنا پر خود اللہ تعالیٰ نے اسکی حفاظت کی ذمہ داری لی،

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ
بیشک ہم ہی نے اس نصیحت کو اتارا ہے اور ہم ہی اسکے نگہبان و محافظ ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے یاد کرانے اور اس کے معنی و مطالب آپ کے ذہن نشین کرانے کا بھی ذمہ لیا،

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ .... (قیامۃ - ۲)
اے پیغمبر نزول وحی کے ساتھ اپنی زبان کو جلدی حرکت نہ دو کہ اسکو جلدی سے یاد کر لو (تمہارے سینہ میں) اسکا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے پس جب ہم (بذریعہ وحی) اسکو پڑھیں تو تم بھی اسکی قرأت کرو پھر اسکا سمجھانا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى
ہم تمہارے لئے (قرآن) پڑھینگے پس تم اسکو نہ بھولو گے،

لوگوں کے سمجھنے اور اس سے نصیحت حاصل کرنے کے لیے قرآن کو آسان رکھا۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (دخان - ۳)
ہم نے قرآن کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ
ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے پس کوئی نصیحت پکڑنے والا۔

اس کے مضامین میں کوئی کجی نہیں رکھی،

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ — عربی زبان کا قرآن جس میں کوئی پیچیدگی نہیں تاکہ لوگ پرہیزگار بن جائیں۔

جس کتاب کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام فرمایا ہو اس کی حفاظت اور صحت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے کیا کیا کوششیں نہ کی ہوں گی، اسی لیے نزول وحی کے ساتھ ہی آپ اس کو لکھا دیتے تھے، صحابۂ کرام کو اس کی تعلیم دیتے وہ اسے پڑھکر خود بھی لکھ لیتے تھے، قرآن کی تعلیم مکہ ہی سے شروع ہو گئی تھی، مدینہ آنے کے بعد اس کی باقاعدہ درسگاہ قائم ہو گئی تھی، جہاں صحابہ کرام تعلیم حاصل کرتے تھے، اور دوسروں کو تعلیم دیتے تھے، بیرونی مسلمانوں کی تعلیم قرآن کے لیے معلمین بھیجے جاتے تھے، ان سب کی تفصیل آیندہ آئے گی؛

خود کلام مجید کی آیات میں اس کی تصریح ہے کہ نزولِ وحی کے ساتھ ساتھ اس کی کتابت بھی ہوتی جاتی تھی،

كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ — ہرگز ایسا نہ کیجیے قرآن نصیحت کی چیز ہے
فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوعَةٍ — جس کا دل چاہے اسکو قبول کرے وہ ایسے
مُّطَهَّرَةٍ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ — صحیفوں میں ہے جو مکرم ہیں بلند مرتبہ ہیں مقدس ہیں، جو ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں جو

ان آیات میں کلام مجید کی کتابت کی تصریح ہے جو ظاہر ہے کہ نزول قرآن کے بعد ہی ہو سکتی ہے، صحف جمع ہے صحیفہ کی اور صحیفہ ورق کو کہتے ہیں، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اوراق میں لکھا جاتا تھا،

عہد رسالت میں قرآن کی جمع و ترتیب پر اجماع؛

اس پر علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب خود آنحضرت نے وحی الٰہی کے مطابق فرمائی تھی، اور موجودہ قرآن اسی ترتیب کے مطابق ہے

اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے، سیوطی نے ان تمام اقوال کو اتقان میں جمع کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

اس پر اجماع ہے اور نصوص متواترہ سے ثابت ہے کہ آیات کی ترتیب بغیر کسی شک و شبہہ کے توقیفی ہے، اس کو بہت سے علماء نے نقل کیا ہے، زرکشی نے برہان میں اور ابو جعفر بن زبیر نے مناسبات میں لکھا ہے، کہ آیات کی ترتیب سورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیف اور حکم کے مطابق ہوئی ہے، اس میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں ہے۔

مکی وغیرہ کا بیان ہے کہ آیتوں کی ترتیب سورتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ہوئی ہے، قاضی ابو بکر نے الانتصار میں لکھا ہے کہ آیات کی ترتیب امر واجب اور حکم لازم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل بتاتے تھے کہ فلاں آیت فلاں مقام پر رکھی جائے...... پورا قرآن جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور اس کو تحریر میں قائم رکھا (یعنی اس کا حکم اور اسکی تلاوت دونوں میں سے کوئی چیز بھی منسوخ نہیں فرمائی) وہ وہی ہے جو دونوں دفتیوں کے درمیان اور مصحف عثمانی پر مشتمل ہے، اس میں نہ کچھ گھٹایا گیا اور نہ بڑھایا گیا، اس کی آیتوں کی نظم و ترتیب بھی وہی ہے جس طرح اللہ اور اس کے رسول صلعم نے اس کو ترتیب دیا تھا، اس میں کسی قسم کی تقدیم و تاخیر نہیں ہوئی ہے، امت نے جس طرح قرآن کی قرأتوں اور اس کی تلاوت کو آنحضرت صلعم سے سیکھا اسی طرح ہر سورہ کی ترتیب بھی آپ ہی کی ہدایت سے کی اور ان کی جگہوں کو جانا اور پہچانا، بغوی شرح السنہ میں لکھتے ہیں

صحابہ کرامؓ نے قرآن کو جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمایا، اس خوف سے کہ اسکے حفاظ کے اٹھ جانے کے بعد اس کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے بغیر کسی کمی اور زیادتی کے دو دفتیوں کے درمیان جمع کیا، اور اس کو اسی طرح لکھا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا، اسکی

ترتیب مین اپنی جانب سے کوئی تقدیم و تاخیر نہین کی، جس قدر قرآن نازل ہوتا جاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اسی ترتیب کے ساتھ جس ترتیب سے وہ موجودہ قرآن مین ہے اپنے اصحاب کو اس کی تعلیم وتلقین فرماتے جاتے تھے، اور یہ ترتیب حضرت جبریل ؑ کی ہدایت سے ہوتی تھی، ہر آیت کے نزول کے وقت وہ بتاتے جاتے تھے کہ فلان آیت فلان سورہ کی فلان آیۃ کے بعد رکھی جائے، اس سے یہ ثابت ہوا کہ صحابہ نے قرآن کو ترتیب نہین دیا تھا، بلکہ (پہلی ترتیب کے مطابق) اس کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا، اس لیے کہ قرآن اسی ترتیب کے ساتھ لوح محفوظ مین لکھا ہوا تھا، اور ضرورت کے مطابق متفرق طور سے نازل ہوتا جاتا تھا، اسی لیے نزولی ترتیب تلاوت کی ترتیب سے مختلف ہے[1]،

ابن حصار کا قول ہے کہ سورتون اور آیتون کی ترتیب وحی کے ذریعہ انجام پائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے تھے کہ فلان آیت کو فلان جگہ رکھو، اور اسی ترتیب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت پر نقل متواتر سے یقین ہے، اور اس پر اجماع ہے کہ اسی ترتیب سے مصحف مین آیتین رکھی گئین[2]،

البتہ سورتون کی ترتیب کے توقیفی یعنی منجانب اللہ ہونے مین علماء کا اختلاف ہے، ایک جماعت کے نزدیک ان کی ترتیب بھی توقیفی ہے، اس لیے کہ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی ترتیب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، لیکن حضرت علی رضؓ، ابی بن کعب رضؓ اور عبد اللہ ابن مسعود رضؓ کے مرتب کردہ مصاحف کی ترتیب عہد صدیقی کے مرتب کردہ مصحف سے مختلف تھی، اس لیے جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ سورتون کی ترتیب مین اجتہاد صحابہ کو دخل ہے،

لیکن عقلی و علمی حیثیت سے تنہا یہ بیانات کافی نہین ہین، اور دیکھنا یہ ہے کہ احادیث سے کہانتک اس کا ثبوت ملتا ہے، اس لیے آیندہ سطور مین حدیثون کی روشنی مین اس مسئلہ پر نظر ڈالی جائے گی،

---

[1] یعنی عہد صدیقی مین [2] اتقان ص ۶۳

آیتون کی ترتیب کا ثبوت احادیث سے

عہد رسالت مین آیتون کی ترتیب اور سورتون کے نام کی تعیین کے بارہ مین اس کثرت سے احادیث ہین کہ اس مین کسی شک و شبہہ کی گنجایش ہی نہین رہ جاتی کہ موجودہ قرآن مجید اسی ترتیب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتب کردہ ہے، یہ روایتین بخاری، مسلم، سنن ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان، مستدرک، مسند احمد بن حنبل، وغیرہ حدیث کی تمام کتابون مین ہین، ان سب کا نقل کرنا دشوار ہے، اس لیے صرف بقدر ثبوت حدیثین پیش کی جائنگی،

مستدرک مین کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضؓ سے روایت ہے:۔

کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
نولف القرآن من الرقاع	مختلف ٹکڑون سے قرآن مرتب کرتے تھے،

ذہبی کی تلخیص مستدرک مین یہ روایت ان الفاظ مین ہے[1]:۔

کنا حول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
نولف القرآن	ارد گرد (بیٹھکر) قرآن مرتب کرتے تھے،

ان دونون روایتون مین تالیف سے مراد یا آیتون کی ترتیب ہے یا سورتون کی یا دونون کی، اور تینون صورتون مین آیتون کی ترتیب ثابت ہوتی ہے، اگر آیتون اور سورتون دونون کی ترتیب مراد ہے تو ثبوت کھلا ہوا ہے، اور اگر سورتون کی ترتیب مراد ہے تو ان کی ترتیب اسی وقت ہو سکتی ہے جب آیتین مرتب ہون، لیکن روایت کے اجمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونون کی ترتیب مراد ہے،

ترمذی مین اس سے زیادہ واضح روایت ہے[2]:۔

قال عثمان کان رسول اللہ صلی اللہ	حضرت عثمان رضؓ نے فرمایا کہ بسا اوقات رسول اللہ
علیہ وسلم مما یاتی علیہ الزمان	صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ساتھ مختلف سورتین

---

[1] مستدرک حاکم و تلخیص مستدرک ذہبی ج ۲ ص ۲۲۹ [2] ترمذی تفسیر سورہ توبہ ص ۵۰۲

وهو ينزل عليه السور ذوات	کی آیتین نازل ہوتی تھین جب ایسی صورت ہوتی
العدد فكان اذا انزل عليه الشئ	تو آپ کسی کاتب وحی کو بلاتے اور سورتون کے
دعا بعض من كان يكتب فيقول	نام بتا کر فرماتے کہ ان آیتون کو فلان فلان
ضعوا هؤلاء الآيات في السورة	سورتون مین رکھو، اور جب ایک ہی
التي يذكر فيها كذا وكذا فاذا	سورہ کی آیت نازل ہوتی تو فرماتے
نزلت عليه الآية فيقول ضعوا	اس کو فلان سورہ مین رکھو،
هذه الآية في السورة التي يذكر فيها	

اس روایت سے نہایت واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزول قرآن کے ساتھ ساتھ اس کی ترتیب فرماتے جاتے تھے،

مسند ابن حنبل مین عثمان بن ابی العاص سے روایت ہے کہ[1]

قال كنت جالسا عند رسول الله	مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
صلى الله عليه وسلم اذ شخص ببصره	بیٹھا تھا کہ آپ نے اوپر نگاہ اٹھائی پھر اسکو
ثم صوبه حتى كاد ان يلزقه	نیچے کیا یہان تک کہ قریب تھا کہ زمین سے
بالارض ثم شخص ببصره فقال	مل جائے پھر نگاہ اٹھا کر فرمایا کہ جبرئیل نے
اتاني جبريل فامرني ان اضع	آکر مجھکو ہدایت کی ہے ان اللہ یامر بالعدل
هذه الآية هذا الموضع من هذه	والاحسان کی آیۃ کو اس سورہ (النحل) کی اس
السورة ان الله يأمر بالعدل	جگہ پر رکھون،
والاحسان الخ	

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۲۱۸

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی ترتیب وحی کے مطابق فرماتے تھے،

یہ تو قرآن مجید کی ترتیب کی اجمالی روایات ہین، حدیثون مین مختلف سورتون کی آیات کی ترتیب کی بھی بکثرت روایتین ہین، بخاری مین سورۂ بقرہ کے فضائل مین ہے[1]:-

عن ابی مسعود قال النبی صلی الله علیه وسلم	ابی مسعود روایت کرتے ہین کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے
من قرأ بالآیتین من آخر سورة	فرمایا کہ جو شخص سورہ بقرہ کی آخری دو آیتین
البقرة فی لیلة کفتاه	رات کو پڑھ لیا کرے تو اس کیلئے کافی ہین،

دوسری روایت مین ہے[2]:-

عن ابی هریرة قال النبی صلی الله	ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ
علیه وسلم اذا اویت الی فراشك	وسلم نے فرمایا کہ جب رات کو سونے کے لیے
فاقرأ آیة الکرسی لن یزال	اپنے بستر پر جاؤ تو آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرو،
من الله حافظ ولا یقربك	تو ہمیشہ خدا کی حفاظت مین رہوگے اور صبح تک
شیطان حتی الصبح	شیطان تمھارے قریب نہ آسکے گا،

ان روایتون مین سورہ بقرہ کی آخری دو آیتون اور آیۃ الکرسی کی تلاوت کے لیے فرمایا گیا ہے جو سورہ بقرہ کے آخر مین ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پوری سورہ مرتب تھی،

سورہ نساء کی ترتیب کی روایت بخاری و مسلم دونون مین ہے[3]:

عن عمر قال ما راجعت رسول الله	عمر سے روایت ہے کہ مین رسول اللہ صلی اللہ
صلی الله علیه وسلم فی شیء ما راجعته	علیہ وسلم سے کلالہ کے متعلق اتنی مرتبہ پوچھا کہ

[1] بخاری ج ۲ ص ۷۴۹ باب فضائل قرآن [2] ایضاً [3] مسلم ج اول باب قراءۃ القرآن و سورۃ البقرہ

فی الکلالۃ وما اغلظ لی فی شیئ	کسی چیز کے متعلق اتنی مرتبہ سوال نہ کیا تھا،
ما اغلظ لی فیہ حتی طعن باصبعہ	اور آپ نے اسکا ایسا سخت جواب دیا کہ کسی چیز
فی صدری وقال تکفیک آیۃ	میں مجھ سے ایسی سختی نہ کی تھی یہاں تک کہ آپ نے میرے
السیف التی فی آخر سورۃ النساء	سینہ میں انگلی مارکر فرمایا کہ اس بارہ میں آیۃ الصیف
......	جو سورۂ نساء کے آخر میں ہے تمہارے لیے کافی ہے

اس روایت سے پوری سورہ نساء کی ترتیب ظاہر ہوتی ہے اس لیے کہ آخری آیت کی تعیین اسی وقت ہوسکتی ہے جب پوری سورہ مرتب ہو،

مسلم میں سورہ بقرہ اور آل عمران کے فضائل میں ہے[۱]:-

عن ابو امامۃ باھلی قال سمعت رسول	ابو امامہ باہلی روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اقرؤا	اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے
القرآن فانہ یاتی یوم القیامۃ	کہ قرآن مجید پڑھا کرو کیونکہ وہ قیامت کے
شفیعا لاصحابہ اقرؤا الزھراوین	دن اپنے پڑھنے والوں کا سفارشی بنکر آئیگا اور
البقرۃ وسورۃ آل عمران فانھما	دو خوبصورت سورتوں بقرہ اور آل عمران
غمامتان او کانھما غیایتان	کی تلاوت کیا کرو وہ دونوں قیامت کے دن
او کانھما فرقان من طیر صواف	بدلی یا چڑیوں کے دو جھنڈوں کی شکل میں نمودار ہوکر
یحاجان عن اصحابھما	اور اپنے پڑھنے والوں کی جانب سے وکالت کرینگی،

مسلم میں سورہ کہف کے فضائل میں ہے[۲]:

عن ابی الدرداء ان النبی صلی اللہ	ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
علیہ وسلم قال من حفظ عشر آیات	نے فرمایا کہ جس نے سورہ کہف کی
من اول سورۃ الکھف عصم من	ابتدائی دس آیتیں یاد کرلیں وہ دجال
فتنۃ الدجال	کے فتنہ سے محفوظ ہوگیا،

اس سے ظاہر ہوا کہ سورہ کہف بھی مرتب تھی،

حدیث کی کتابوں میں سورتوں کے فضائل اور نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کی تلاوت کے سلسلہ میں قرآن مجید کی تقریباً تمام سورتوں کا ذکر آتا ہے، ان سب کی روایات نقل کرنا دشوار ہے، اس لیے صرف ان کے نام لکھدیے جاتے ہیں، بخاری اور مسلم میں حسب ذیل سورتوں کی تلاوت نبوی کا ذکر ہے[۱]،

بقرہ، آل عمران، انشقاق، مومنون، تین، لیل، قاف، مرسلت، تکویر، اور بقرہ اور آل عمران، کہف اور اخلاص و معوذتین کے فضائل آپ کی زبان مبارک سے منقول ہیں[۲]،

ابوداؤد میں حسب ذیل سورتوں کی تلاوت نبوی کا ذکر ہے[۳]،

رحمن، نجم، اقتربت الساعۃ، الحاقہ، طور، ذاریات، واقعہ، نون، نازعات، تطفیف، عبس، مدثر، مزمل، قیامۃ، دہر، عم یتساءلون (دہنار) مرسلت، دخان اور شمس،

ترمذی میں آل عمران، کہف، یٰس، حم دخان، ملک، زلزال، اخلاص اور معوذتین کے فضائل ہیں[۴]،

نسائی میں بقرہ، کافرون، روم، اخلاص، قاف، تکویر، معوذتین، سجدہ، دہر کی تلاوت کا تذکرہ ہے[۵]،

دارمی میں حسب ذیل سورتوں کے فضائل ہیں، آل عمران، انعام، ہود، کہف، سجدہ، ملک، طٰہٰ، یٰس، حوامیم اور مسبحات[۶]،

---

۱ ج ۱، ص ۲۹۹ باب فضل قراۃ القرآن وسورۃ البقرہ ۲ ایضاً باب فضل سورۃ الکھف وآیۃ الکرسی ج ۱ ص ۳۰۰

۱ بخاری و مسلم کتاب الصلوٰۃ ۲ ایضاً فضائل مذکورہ ۳ ابوداؤد ج ۱ باب تحزیب القرآن ۴ ترمذی ابواب فضائل القرآن ۵ نسائی کتاب افتتاح الصلوٰۃ کے مختلف ابواب ۶ مسند دارمی کتاب فضائل القرآن،

حوامیم میں، مومن، سجدہ، شوریٰ، زخرف، دخان، جاثیہ اور احقاف اور مسبحات میں حدید، مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق اور تحریم کی سورتیں ہیں،

آیات سجدہ کے سلسلہ میں اعراف، رعد، بنی اسرائیل، مریم، حج، فرقان، نمل، سجدہ، صاد، حم سجدہ، نجم، انشقاق اور اقرأ کا نام آتا ہے،

ان کے علاوہ اور مختلف سلسلوں میں بہت سی سورتوں کے نام ملتے ہیں، لیکن ان سب کا استقصا مقصود نہیں ہے، کنز العمال باب فضائل السور میں قرآن مجید کی تمام سورتوں کے فضائل کی روایتیں ہیں، گو مذکورہ بالا سورتوں کی روایات میں ان کی ترتیب کا ذکر نہیں ہے، لیکن اوپر ترمذی کی روایت سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آپ نزول قرآن کے ساتھ سورتوں میں آیتوں کی ترتیب قائم فرماتے جاتے تھے، اور بعض سورتوں کی ترتیب کی تصریح بھی اوپر گذر چکی ہے، اس سے یہ ظاہر ہے کہ جن سورتوں کے نام حدیثوں میں آئے ہیں، ان سب کی آیات مرتب ہوں گی،

اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بعض روایتوں میں آیات کی مختلف تعداد کی تلاوت پر اجر کی مقدار بتائی گئی ہے، دارمی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے ایک رات میں قرآن کی سو آیتیں تلاوت کیں تو اس کے عمل میں ایک رات کا قنوت لکھا جائے گا، اور جس نے ایک ہزار آیتیں تلاوت کیں تو اس کو ایک قنطار کے برابر ثواب ملے گا،[۲]

یہ ظاہر ہے کہ جب تک آیتیں مرتب نہ ہوں گی اس وقت تک ان کی کسی مقررہ تعداد کی تلاوت کس طرح ممکن ہے، اور ہزار آیات کی تلاوت کے یہ معنی ہیں کہ بہت سی بڑی سورتیں مرتب تھیں،

عہد رسالت میں پورے قرآن کی تلاوت

مذکورۂ بالا مباحث کا تعلق آیات کی ترتیب اور سورتوں کی تکمیل سے تھا، حدیثوں میں بکثرت ایسی روایتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں قرآن

[۱] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کنز العمال ج ۱ ابواب فضائل قرآن [۲] مسند دارمی باب من قرأ مائة آية الى الالف

مرتب ہو چکا تھا[۱] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اس کا دورہ کرتے تھے، حضرت عبد اللہ رضی ابن عمرو بن العاص کے پورے قرآن کی تلاوت کی روایت بخاری، مسلم، سنن بیہقی، مستدرک اور حدیث کی متعدد کتابوں میں ہے، آپ بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے، رات دن عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے، اس مشغولیت کی وجہ سے بیوی کی جانب بھی متوجہ ہونے کا موقع نہ ملتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے عبد اللہ کو بلا کر ان سے پوچھا، روزے کس طرح رکھتے ہو، انھوں نے جواب دیا روزانہ، پوچھا قرآن کس طرح ختم کرتے ہو، "کیف تختم" کہا ہر شب میں، فرمایا ہر مہینہ میں صرف تین روزے رکھا کرو، اور ایک مہینہ میں قرآن ختم کیا کرو، انھوں نے عرض کیا میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، فرمایا اچھا ہفتہ میں تین روزے رکھا کرو، اور دو دن افطار کیا کرو، عبد اللہ نے پھر وہی جواب دہرایا، آپ نے فرمایا تو صوم داؤد رکھا کرو جو سب سے افضل ہے، یعنی ایک دن روزہ اور ایک دن افطار، اور سات دن میں قرآن ختم کیا کرو،[۲]

[۱] اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ سورتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے، ایک جماعت کی رائے ہے کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی نہیں ہے بلکہ اس میں اجتہاد صحابہ کو دخل ہے، اور یہی رائے صحیح ہے، اسلیے کہ متعدد صحابہ کے مرتب کردہ مصاحف کی ترتیب جو انھوں نے اپنے طور پر مرتب کیے تھے موجودہ مصحف یا مصحف صدیقی و عثمانی سے مختلف ہے، اسلیے عہد نبوت یا آنحضرت صلعم کی سورتوں اور قرآن کی ترتیب سے یہ مراد ہے کہ آپ نے تلاوت کے لیے سورتوں کی ترتیب فرمادی تھی، مگر اسکی پابندی دوسروں کیلیے ضروری نہیں تھی، یہ واضح رہے کہ ہر جگہ ترتیب قرآن کے لفظ سے پورے قرآن کی ترتیب مراد نہیں ہے بلکہ جسقدر نازل ہوتا جاتا تھا اس کی ترتیب ہوتی جاتی تھی، البتہ آپ کی وفات سے پہلے پورے قرآن کی ترتیب ہو گئی تھی، اور یہ ترتیب وہی تھی جس کے مطابق حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو قرآن سنا اور آپکو سنایا تھا،

[۲] بخاری ابواب فضائل القرآن باب فی کم یقرأ القرآن

اس روایت مین ختم قرآن کی تصریح ہے، اور ایک مہینہ پھر بدرجۂ اقل ایک ہفتہ کی مدت کی تعیین سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پورے قرآن کا دورہ کرتے تھے، ورنہ ایک مہینہ یا ایک ہفتہ مین اس کے کسی جز کی تلاوت تو کوئی بار نہین ہے۔

بعض روایتون مین ختم قرآن کی کم سے کم مدت تین دن مقرر فرمائی ہے[1]،

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص	عبد اللہ بن عمرو بن العاص کا بیان ہے
قال امرنی رسول اللہ صلعم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھکو حکم
ان لا اقرء القرآن اقل	دیا کہ تین دن سے کم مین قرآن کا
من ثلث	دورہ نہ کرون،

اور اس کا سبب یہ بیان فرمایا ہے[2]،

لم یفقہ القرآن من قرأ	جو شخص تین دن سے کم مین قرآن پڑھیگا
القرآن فی اقل من ثلاث	وہ اس کو سمجھ نہین سکتا،

خود آپ بھی تین دن سے کم مین قرآن ختم نہین کرتے تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہین[3]:

کان لا یختم القرآن فی اقل	آپ تین دن سے کم مین قرآن ختم
من ثلاث	نہین کرتے تھے،

کنز العمال مین بروایت مصنف ابن ابی شیبہ یہ روایت ہے، کان ممن ختم القرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتیٰ عثمان بن عفان وعلی بن ابی طالب وعبد اللہ ابن مسعود (کنز العمال ج) اس روایت سے خواہ ختم قرآن سے پورے قرآن کی تلاوت مراد لی جائے یا اس کا حفظ دونون سے مقصود حاصل ہے،

[1] سنن دارمی فضائل القرآن باب فی ختم القرآن [2] ترمذی ابواب القراءت [3] فتح الباری ج ۹ ص ۸۳،

ان تمام روایات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی مین پورا قرآن پڑھا جاتا تھا، ورنہ اسکے کسی حصہ اور ٹکڑے کی تلاوت کے لیے مدت کی تعیین کی ضرورت ہی نہ تھی،

اس سلسلہ مین سب سے اہم بخاری کی یہ روایت ہے[1]:

عن فاطمۃ قالت اسر الی	حضرت فاطمہ زہراؓ بیان فرماتی ہین کہ
النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان جبریل	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے خفیہ طریقہ سے
یعارضنی بالقرآن کل سنۃ مرۃ	فرمایا کہ جبریل ہر سال ایک مرتبہ مجھے
وانہ عارضنی العام مرتین ولا اراہ	قرآن سنتے اور سناتے تھے، اور اس
الا حضور اجلی	سال دو مرتبہ سنا اور سنایا جو میری موت کے

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسقدر قرآن مجید ہر سال نازل ہوتا جاتا تھا اسکی صحت کے لیے یا اور کسی مصلحت سے حضرت جبریل اسکو آنحضرت صلعم کو سناتے اور آپ سے سنتے جاتے تھے اور آپ کے سال وفات مین دو مرتبہ یہ عمل کیا جس سے مقصود آخری مرتبہ اس کی صحت رہی ہوگی، "حضور اجلی" سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آپ کے سنہ وفات کا واقعہ ہے، جس وقت تقریباً پورا قرآن نازل ہو چکا تھا، اور وہ مرتب بھی تھا، ورنہ پورے قرآن کی تلاوت کس طرح ہو سکتی،

ختم قرآن کے فضائل ترتیب قرآن کا ایک ثبوت اسکے دورے کے فضائل کی حدیثین بھی ہین:

اس سلسلہ مین سب سے مفصل روایت مستدرک حاکم کی ہے[2]،

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ	ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص
قال قام رجل الی النبی صلعم	نے کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] بخاری ج ۲ باب کان جبریل یعرض القرآن علی النبی صلعم [2] مستدرک کتاب فضائل القرآن باب فضیلۃ الحال والمرتحل ج اول ص ۵۶۹

فقال یا رسول اللہ ای العمل افضل او ای العمل احب الی اللہ تعالیٰ قال الحال والمرتحل الذی یفتح القرآن ویختمہ صاحب القرآن یضرب من اولہ الی آخرہ ومن آخرہ الی اولہ کلما حل ارتحل[1]

سے پوچھا یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے افضل عمل یا سب سے پسندیدہ عمل کون ہے، آپ نے فرمایا منزل کرنے والا اور کوچ کرنے والا جو قرآن کو شروع کرکے اسکو ختم کرتا ہے اور اسکے اول کو اس کے آخر تک پہنچاتا ہے اور ختم کرکے پھر شروع کرتا ہے اور جب منزل کرتا ہے تو کوچ کر جاتا ہے (یعنی برابر دورہ کرتا رہتا ہے)

اس روایت سے بھی ظاہر ہوتا ہے قرآن مجید عہد نبوی میں مرتب ہو چکا تھا، ورنہ پھر اسکے دورے کے کیا معنی،

سورتوں کے لحاظ سے قرآن کی تقسیم عہد رسالت میں

اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن کو سورتوں کے اعتبار سے چار حصوں میں تقسیم فرمایا تھا، حدیث کی بہت سی کتابوں میں یہ روایت ہے، "اللہ تعالیٰ نے مجھکو توراۃ کی جگہ سبع طوال عطا فرمائیں، انجیل کی جگہ مثانی اور زبور کی جگہ مائین اور مفصل مزید مرحمت فرمائیں،[2]

سبع طوال میں بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انعام، اعراف اور یونس ہیں،

مائین میں یونس کے بعد کی وہ سورتیں جن میں سو یا اس سے کچھ کم وبیش آیتیں ہیں،

مثانی مائین کے بعد کی سورتیں سورہ قاف تک

مفصل قاف کے بعد سے آخر قرآن تک کی سورتیں،

پھر مفصل کی تین قسمیں ہیں طوال، اوساط اور قصار

[1] مستدرک حاکم ج اول ص ۵۶۹ [2] ابن جریر نے اسکے تمام طرق کی روایتیں جمع کر دی ہیں، ملاحظہ ہو ج ۱ ص ۲۳

اسی طریقہ سے تلاوت میں سہولت کے خیال سے قرآن مجید متعدد حزبوں میں تقسیم تھا، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اس کے مطابق تلاوت کرتے تھے، اوس بن حذیفہ ثقفی کا بیان ہے کہ جب ثقیف کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا تو آپ روزانہ عشاء کے بعد ہمارے پاس تشریف لاکر باتیں فرماتے، ایک دن معمول سے دیر میں آئے، ہم لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا، آپ نے فرمایا،

طرأ علی حزبی من القرآن فاحببت ان لا اخرج حتی اقرأہ او قال اقضیہ فلما اصبحنا سألنا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احزاب القرآن کیف تحزبونہ فقالوا ثلاث وخمس وسبع وتسع واحدی عشرۃ وحزب المفصل

قرآن کا جتنا حصہ میں روزانہ تلاوت کرتا تھا دفعۃً یاد آیا، اسلیے میں نے چاہا کہ اسکو پڑھکر یا پورا کرکے نکلوں، اوس بن حذیفہ کا بیان ہے کہ دوسرے دن صبح کو ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے پوچھا کہ آپ لوگ قرآن کو کس طرح حزبوں میں تقسیم کرتے ہیں، انھوں نے کہا تین یا پانچ یا سات یا نو یا گیارہ حصوں میں اور حزب مفصل میں،

حزب کے لغوی معنی گروہ یا کسی چیز کی باری کے ہیں، اور اصطلاح میں ٹکڑے یا حصہ کو حزب کہتے ہیں، حزب قرآن سے مراد اسکی وہ تقسیم ہے جو تلاوت اور ورد میں سہولت کے لیے کی جائے،[2] دعا اور اوراد کی کتابیں اسی لئے حزب کہلاتی ہیں کہ تلاوت کے لیے انکو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، جیسے حزب البحر وغیرہ،

ان روایات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ پورا قرآن عہد رسالت میں مرتب تھا، اور صحابۂ کرام مختلف حزبوں میں تقسیم کرکے اس کی تلاوت کرتے تھے،

(باقی)

[1] مسند ابو داؤد طیالسی احادیث اوس بن حذیفہ ثقفی ص ۱۵۱ مطبوعہ دائرۃ المعارف و سنن ابی داؤد ج اول باب تحزیب القرآن میں بتغیر الفاظ یہ روایت موجود ہے [2] مجمع بحار الانوار ج اول ص ۲۵۹

عہد اسلامی کا ہندوستان

مملوک سلاطین دہلی

از

مولانا سید ریاست علی ندوی

راقم سطور کے ایسے مضامین کا مجموعہ جن کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے ہندوستان کے اسلامی دور کی تاریخ سے وابستہ ہے "عہد اسلامی کا ہندوستان" کے نام سے ترتیب پایا ہے، اور پریس میں جا چکا ہے، اس مجموعہ کی ترتیب میں زمانہ اور مباحث کے اعتبار سے کہیں کہیں خلا محسوس ہوا تو اس کمی کو چند نئے ابواب یا مضامین کو قلمبند کرکے پورا کیا گیا ہے، تاکہ مضامین میں ایک دوسرے سے ایک قسم کا ذہنی ربط قائم ہو جائے، اور مطالعہ کے وقت ایک مضمون کے بعد دوسرے کو پڑھنے میں ذہن کو اجنبیت محسوس نہ ہو، اسی سلسلہ میں سلطنت مملوک سلاطین دہلی" کے عنوان سے ایک مستقل مقالہ تحریر پایا ہے جو اس مجموعہ میں مقالہ "سلطان شہاب الدین غوری اور ان کے قاتل، مقتل و مرقد" کے بعد رکھا گیا ہے، یہ نئے لکھے ہوئے حصے اپنی جگہ علٰحدہ علٰحدہ مضامین ہیں، مناسب معلوم ہوا کہ ان میں سے "مملوک سلاطین دہلی" کے دور کو ناظرین معارف کے سامنے بھی پیش کیا جائے،

"ر"

شہاب الدین غوری کی اچانک شہادت سے ہندوستان میں اس کے فوجی افسر ایک نازک صورت حال سے دوچار ہوئے، قطب الدین ایبک اس کا نائب السلطنت تھا، اور یہ ملک تین حصوں یعنی پنجاب،

شمالی ہند اور سندھ میں بٹ کر غزنی کے ماتحت تھا، اور ملک کی مختلف سمتوں میں یہاں کی قدیم سلطنتوں کے حکمراں اپنے مورچے سنبھالے ہوئے تھے، جیسا کہ اوپر گذرا شہاب الدین کے اولاد نرینہ نہ تھی، اس کا بھتیجا سلطان غیاث الدین محمود غور کا مالک تھا، مگر اس میں رہنمائی کی طاقت نہ تھی، اور خوارزمیوں کے اٹھتے ہوئے طوفان سے وہ غور و غزنی کو بھی بچانے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا، اس کے تین ترک غلام فوجی گورنروں میں تاج الدین یلدز کرمان و سنگران کا جو افغانستان سے بالائی سندھ کی راہ پر واقع ہیں، مالک تھا، غزنی کا مالک بنا، اور اس لحاظ سے اس نے اپنے آپ کو ہندوستانی صوبوں کو اپنے ماتحت تصور کرنے کا مستحق سمجھا، مگر اس کے داماد ناصر الدین قباچہ تک نے اس کے اس استحقاق کو تسلیم نہیں کیا، اور قطب الدین ایبک کیلئے اس کا قبول کرنا زیادہ بعید از تصور تھا، اس لئے شہاب الدین غوری کی شہادت کے بعد ہی غزنی سے ہندوستان کا رشتہ ٹوٹ گیا، اور یہاں اس کے نام لیوا غلاموں کی آزاد سلطنت قائم ہو گئی،

سلطان قطب الدین ایبک
سنہ ۶۰۲ - سنہ ۶۰۶

سلطان قطب الدین ایبک شہاب الدین غوری کا نامور ترک سپہ سالار تھا، وہ ہندوستان میں اسلامی مساوات و اخوت کا روشن منارہ تھا، وہ غلاموں کی صف سے نکل کر سلاطین کے تخت پر بیٹھا اور اس کے بعد غلام در غلام سلاطین دلی کے تخت پر بیٹھتے گئے، قطب الدین پہلی مرتبہ ترکستان سے نیشاپور میں لایا گیا تھا، یہاں امام اعظم ابو حنیفہ کے اخلاف میں سے ایک صاحب علم بزرگ فخر الدین عبد العزیز کوفی قاضی القضاۃ کے منصب پر سرفراز تھے، انھوں نے اس بچہ کو خرید کر اپنی اولاد کے ساتھ مکتب میں بٹھایا، جس میں اس نے علوم کی تحصیل کی اور شہسواری اور تیراندازی کے فنون سیکھے، قاضی صاحب کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں میں سے کسی نے اس کو فروخت کیا، اور ایک سوداگر نے اس کو سلطان شہاب الدین غوری کے دربار میں گرانقدر قیمت لیکر فروخت کیا، اور یہیں وہ اپنی ٹوٹی ہوئی کن انگلی کی وجہ سے ایبک سے مخاطب کیا گیا، وہ اپنے آقا کا جان نثار تھا، اور غوری کو بھی اس پر غیر معمولی اعتماد تھا، ترادڑی کی لڑائی کے بعد کھاندور کی لڑائی میں آمادہ کے

قریب قنوج کے راجہ جے چند کی آنکھ میں جب تیر لگا، اور وہ کام آیا تو پھر ایبک کی راہ روکنے والا کوئی موجود نہ تھا، بنارس تک اس نے قبضہ کر لیا، اور بے شمار دولت ہاتھ آئی، اسی موقع پر شہاب الدین نے "ہندوستان" کی حکومت کی باگ اس کے ہاتھ میں دی، کالنجر کی فتح کے بعد چندیلی راجاؤں کے پایہ تخت مہوبا پر قبضہ کیا، پھر سیدھا ہوتا ہوا راجہ گوبند رائے کی راجدھانی دلی میں پہنچا، جو غوری کی اطاعت قبول کرنے کے بعد منحرف ہو چکا تھا، اس کو نئے سرے سے فتح کیا، پھر اس نے راجہ بھردوج سے اجمیر، راجہ بھیم دیو سے نہروالہ لے لیا، اور راجپوتوں کی آخری جتھہ بندی کو توڑا، اور پھر ملکی انتظام میں مصروف ہو گیا، سلطان شہاب الدین غوری نے آخری سفر ہند کے موقع پر ۶۰۲ھ ۱۲۰۶ء میں اس کو "ملک" کے خطاب سے سرفراز کیا،

سلطان شہاب الدین غوری کے دور تک یہ اس کا غلام تھا، اس کو رسمی آزادی اس وقت ملی جبکہ شہاب الدین غوری کے شرعی وارث اور شاہ غور سلطان غیاث الدین محمود نے اس کو بہ روایت یوم سہ شنبہ ۱۸ ذیقعدہ ۶۰۳ھ اور بہ روایت ۶۰۵ھ ۱۲۰۸ء میں "چتر و امارت بادشاہی و خطاب سلطانی و خط آزادی" عطا کیا، اور سلطان ایبک کے لقب سے لاہور میں اس کی تخت نشینی کی رسم انجام پائی، اس کے بعد اپنا پایہ تخت لاہور سے ہندوستان کے قلب اور اس کی پرانی راجدھانی دہلی میں لے آیا، اور وہی سلاطین دہلی میں سے پہلا سلطان قرار پایا،

دہلی کی سلطنت بھٹنڈے سے لکھنوتی تک تقریباً ایک ہزار میل طویل، اور تقریباً پانسو میل عریض یعنی ۴ ½ لاکھ مربع میل کے رقبہ میں تھی، بنگال و بہار کو اگرچہ اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی نے فتح کیا تھا، اور وہ اس پورے علاقہ کا صوبہ دار اعلیٰ تھا لیکن اس نے نظم قائم رکھنے کیلئے دلی سلطنت کی سیادت قبول کر لی تھی، اور خود قطب الدین سے ملنے دلی آیا تھا، ایبک کا دوسرا حریف بہاء الدین طغرل جو بیانہ اور گوالیار کا فاتح تھا، اس کی موت سے وہ علاقہ بھی اس سلطنت کا حصہ بن چکا تھا، اگرچہ اس کی زندگی کے آخری دور میں بختیار خلجی کا حادثۂ قتل پیش آیا، اور لکھنوتی کو نئی سیاسی صورت حال سے سابقہ کرنا پڑا،

جس کو سلجھانے کا ایبک کو نہ مل سکا تھا، قطب الدین ایبک نے ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ء میں لاہور میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر وفات پائی، اور وہیں اس کا مزار ہے،

قطب الدین ایبک وہ پہلا سلطان ہے، جس نے ہندوستان کو اپنا دیس سمجھا، اس کیلئے روئے زمین پر کوئی ایسا دوسرا ملک نہ تھا، جس سے اس کا وطنی رشتہ قائم رہ گیا ہو، وہی پہلا سلطان ہے جو ہندوستان کے پایہ تخت کو وسط ایشیا سے اٹھا کر دلی میں لایا، اس نے پنجاب کو جو ہندوستان سے مستقل طور پر علیحدہ ہو کر غزنی سلطنت کا حصہ بن چکا تھا، دوبارہ ہندوستان میں ملا لیا، اسی لئے اس نے اپنی تاجپوشی کی رسم لاہور میں منائی اور وہیں فرمان روا تھا، جو راجہ ہرش کے بعد پشاور سے بنگال تک کی سرزمین کو ایک چتر کے سایہ میں لے آیا، وہ اب ترکستانی اور غوری نہ تھا، ہندوستانی تھا، ترکستان اور غور اس کیلئے اسی طرح غیر تھے، جیسے راجہ ہرش اور اس کے اجداد کیلئے روس کے گھاس کے میدان، وہ راجہ ہرش ہی کے نقش قدم پر چلا، اور اس نے اس ملک سے طوائف الملوکی کا خاتمہ کیا، اور نہروالہ سے لکھنوتی تک کے باشندے ایک ملک اور ایک سلطنت کے شہری کہلائے،

ایبک کا عہد حکومت سلطان ایبک فطرۃً نیک سرشت، سخی اور عدل پرور تھا، اور بے دریغ انعام و اکرام سے لوگوں کو مالا مال کرتا، اس کی سخاوت ضرب المثل تھی، "لک بخش" (لاکھ کا بخشنے والا) اس کا لقب مشہور ہو گیا تھا، اس نے نہ صرف ہندوستان میں شہاب الدین غوری کی نیابت کی، بلکہ اپنے خسر تاج الدین یلدز کو غزنی کے تخت سے برطرف کر کے چالیس روز وہاں حکمرانی کی اور اپنی داد و دہش سے وہاں بھی نام آوری حاصل کی، اس نے دہلی کی تسخیر کے بعد ۲۰ سال تک حکمرانی کی جن میں آخر کے چار سال چند مہینوں میں صاحب چتر و تاج و تخت رہا، اس کی قلمرو میں اس کے نام کا سکہ و خطبہ جاری رہا، اس نے رعایا کے درمیان عام ہر دلعزیزی حاصل کی اور لوگوں کے دلوں میں اس کے عہد حکومت کی خوشگوار یاد مدت دراز تک باقی رہی،

ایبک کے دور کے ممتاز اکابر قطب الدین نیشاپور کی درسگاہ میں علوم کی تحصیل کر چکا تھا، اس کا دربار

علم و ادب کا مرکز تھا، مشہور ادیب و شاعر بہاء الدین محمد اوشی اور جمال الدین محمد نصیر کے قصیدے اور بعض اشعار تذکروں اور سیاسی تاریخوں میں موجود ہیں، جن میں ایبک کے جود و سخا، شجاعت، فیاضی اور عدل پروری کو والہانہ انداز میں قلم بند کیا گیا ہے، شیخ صدر الدین محمد بن حسن نظامی نیشاپوری جو اپنے زمانہ میں انشاء و تاریخ و سیر کا امام سمجھا جاتا تھا، ایبک کے دامن دولت سے وابستہ تھا، اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب تاج المآثر جو مملوک سلاطین دہلی پر سب سے پہلی کتاب ہے، ایبک ہی کے حکم سے ۶۰۲ھ میں لکھنی شروع کی جس میں ۵۸۶ھ سے ۶۱۴ھ یا ۶۱۶ھ تک کے وقائع قلم بند کئے ہیں، اسی طرح اس عہد کے دوسرے ممتاز اعیان و علماء میں شیخ احمد بن علی ترمذی متوفی ۶۰۲ھ، قاضی حمید الدین علی بن عمر محمودی اور قاضی وجیہ الدین کاشانی وغیرہ تھے، بعض اہل علم صاحب سیف بھی تھے، چنانچہ شیخ محمد بن احمد مدنی (مولود ۵۸۱ھ متوفی ۶۴۶ھ) جنھیں التتمش کے دور میں غیر معمولی عزت و اکرام حاصل ہوا ایبک کے دور کے صاحب سیف فاتح تھے، کڑہ مانک پور اور ہنسوا وغیرہ کے قلعے انہی نے فتح کئے تھے، اسی طرح شیخ قدوۃ الدین بن میرک شاہ اسرائیلی معروف بہ قاضی قدوہ متوفی ۶۰۵ھ کے فوجی خدمات کے افسانے اودھ کے ۵۲ گانو میں آج بھی شہرت رکھتے ہیں، ان کے صاحبزادے اعز الدین عہدۂ قضا پر سرفراز تھے،

شمالی ہند میں مسلمانوں کے اس ابتدائی دور میں اسلامی علوم و فنون کا ایسا عام چرچا ہو گیا تھا، کہ یہاں کے ایک نو مسلم صاحب علم نے روایت حدیث میں ایک خاص قسم کی شہرت حاصل کی، ان کا ذکر فن رجال (جس میں حدیث کے راویوں کی سوانح عمری اور جرح و تعدیل ہوتی ہے) کی بیشتر اہم کتابوں میں آیا ہے، سرباتک ہندی متوفی ۳۳۳ھ کی طرح اس زمانہ میں شیخ ابو الرضا رتن بن کربال بن رتن ہندی کو شہرت حاصل ہوئی، ان کا ذکر صلاح الکتبی، امام ذہبی، علامہ ابن حجر عسقلانی، صلاح صفدی، امام صغانی اور صاحب بحر زخار نے تفصیل سے کیا ہے، رتن بھٹنڈہ میں پیدا ہوئے، اور قبول اسلام کے بعد ارباب خیر و صلاح میں شمار کئے گئے، عمر طبعی سے بہت زیادہ سن پایا، اور ان کی اس روایت کا

عام چرچا پھیلا کہ وہ عہد رسالت میں موجود تھے، ایک مرتبہ وہ تجارت کے سلسلہ میں حجاز گئے ہوئے تھے، ایک موقع پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے منصب رسالت پر فائز ہونے سے پہلے ملے، دوسری مرتبہ نبوت کے بعد انھیں زیارت کا موقع ملا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں عمر کی درازی کی دعا دی، اور بعض باتیں ارشاد فرمائیں، جب ان روایتوں کی شہرت عالم اسلام میں پہنچی تو بڑے بڑے ائمۂ فن ان سے ملنے، روایتیں لینے اور تحقیق حال کرنے کیلئے ہندوستان آئے، اور ان کی تحقیق یا تکذیب کی اور یہ فن رجال کا ایک مستقل موضوع بن گیا، اور رجال کی مشہور کتابوں میں یہ جرح و تعدیل ضبط ہیں، اور ائمۂ فن نے اپنے محاکمے لکھے ہیں، انھوں نے ۶۰۰ھ کے بعد وفات پائی اور بھٹنڈہ میں مدفون ہوئے،

علامہ نظام الدین فرغانی فقہ و اصول کے ماہرین میں سے تھے، ہندوستان میں تشریف لائے قسمت نے انھیں بنگال سے وابستہ کیا، محمد بن بختیار خلجی نے ان کی قدردانی کی اور بنگال میں ان کے وجود سے علم کا چراغ روشن رہا،

صلحائے امت ایبک کے عہد حکومت کو صلحائے امت میں سے ہندوستان کے سرتاج مشائخ حضرت خواجہ سید معین الدین حسن بن حسن چشتی سجزی اجمیری قدس سرہٗ کی ذات بابرکات کے وجود گرامی کا شرف حاصل ہے، حضرت خواجہ سجستان میں ۵۳۶ھ میں پیدا ہوئے، ۱۲، ۱۵ سال کی عمر میں سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا، انگور کا باغ اور ایک پن چکی وراثت میں پائی، کسی مجذوب حال کا باغ سے گذر ہوا، اور حضرت خواجہ پر جذب ربانی طاری ہو گیا، ترک علائق کر کے حق کی طلب و جستجو میں اٹھ کھڑے ہوئے، سجستان سے سمرقند تشریف لے گئے، قرآن پاک حفظ کیا، علوم کی تحصیل فرمائی، پھر مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے قریۂ ہارون میں حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، اور شیخ کی خدمت میں اپنی زندگی کے بیس سال گذار دیئے، انہی کی معیت میں دیار اسلامی کی سیاحت

کی، اور شیخ نے خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا، پھر مختلف مقامات پر اس دور کے ممتاز صالحین امت شیخ
نجم الدین کبریٰ، حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ وغیرہ اکابر
وقت کی صحبت سے فیضیاب ہوئے، آخر میں مدینہ منورہ میں حاضری دینے کے بعد ہندوستان کا رخ
فرمایا، اور لاہور میں آکر حضرت شیخ ہجویری اور حضرت حسین زنجانی کے مزار پر چلہ کش ہوئے، پھر ملتان میں
تشریف لائے، اور یہاں پانچ برس قیام فرماکر ہندوستان کی زبان سنسکرت یا پراکرت سیکھی اور پھر
وہاں سے دہلی تشریف لائے اور یہاں سے اجمیر کا قصد فرمایا، اور ۵۶۱ھ یا ۵۶۲ھ سے وہاں مستقل توطن
اختیار فرمایا، اس وقت تک یہ مقامات پرتھوی راج کے قبضہ میں تھے، مسلمان کشور کشاؤں کے زیرنگیں نہیں
آئے تھے، مگر ان مرکزی شہروں میں حضرت خواجہ کے فیض صحبت سے اسلام کی روشنی پھیلی اور توحید اسلام کا نام
لینے والوں کی ایک جماعت تیار ہوگئی، خصوصاً اجمیر میں ایک خلق کثیر حلقہ بگوش اسلام ہوگئی جن میں پرتھوی
راج کے چند خاص شاہی عمال بھی تھے، جس کی وجہ سے اجمیر کے ارباب حکومت میں سراسیمگی پھیلی، اور عمال
حکومت حضرت خواجہ کے درپے آزار ہوئے، اور اجمیر سے انھیں جلاوطن کرنا چاہا، دوسری طرف دھرم شاستر
کے جوگیوں نے اپنی تپسیا سے جو طاقت حاصل کی تھی، اس کو حضرت اجمیریؒ کے خلاف استعمال کرتے رہے،
اور ریاضت و مجاہدہ اور تپسیا سے حاصل کی ہوئی قوتوں میں جو معرکہ آرائی ہوئی، اس میں حضرت خواجہ
اجمیریؒ کو کامرانی حاصل ہوئی، اور جوگیوں کے زیر ہونے کے بعد ایک کثیر خلقت اسلام کے آغوش میں آگئی،
اس اثنا میں سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۸۸ھ میں پرتھوی راج کو شکست دے کر دہلی کی سلطنت کو
قطب الدین ایبک کے سپرد کیا، اور اجمیر کی ولایت پر سید وجیہ الدین مشہدی مامور کئے گئے، جن کی صاحبزادی
سے حضرت خواجہ کا عقد نکاح انجام پایا، اور یہ مسلم حکمراں خاندان بھی حضرت خواجہ کے عقیدت مندوں
میں داخل ہوگیا، اور حضرت خواجہ کے روحانی فیوض و برکات کے ساتھ سیاسی اقتدار سے اسلام کو اس دیار
میں مزید تقویت حاصل ہوئی،

حضرت خواجہ کا وجود گرامی ہندوستان میں روحانی فیوض و برکات کا ایسا منارہ ثابت ہوا جس سے ہندوستان
کے گوشہ گوشہ میں روشنی پہنچی اور لاکھوں بندگان خدا نے ہدایت حاصل کی، سلسلۂ چشتیہ کا فیض حضرت والا
ہی کے توسط سے پہلی مرتبہ ہندوستان میں عام ہوا، اور آج بھی اس کے انوار قدس سے ہندوستان
میں روحانیت کا نظام قائم اور ارباب بصیرت کیلئے اس کے چپہ چپہ میں درخشانی موجود ہے، حضرت
خواجہ ۶۲۷ھ یا بہ روایت ۶۳۲ھ یا ۶۳۳ھ میں واصل بحق ہوئے، اور اجمیر کی درگاہ آج بھی زیارت گاہ
خلائق ہے،

حضرت خواجہ اجمیریؒ کی طرف تین کتابیں انیس الارواح، رسالہ در کسب نفس اور دلیل العارفین
منسوب ہیں، اول الذکر میں حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے ملفوظات ہیں جن کو غالباً حضرت خواجہ اجمیریؒ
کے کسی مرید نے ان سے سن کر یکجا کیا ہے، اور دلیل العارفین میں خود حضرت خواجہ اجمیریؒ کے ملفوظات
ان کے ارشد خلیفہ حضرت بختیار کاکیؒ نے یکجا کئے ہیں، اور یہ کتاب اہل اصلاح میں متداول ہے، حضرت
خواجہ اجمیری کی طرف امام حسین علیہ السلام کی شان میں وہ مشہور رباعی بھی منسوب ہے، جس کا آخر مصرع
"حقا کہ بنائے لا الہ است حسین" ہے،

حضرت خواجہ اجمیری کے خلفا و مریدین میں حضرت سید حسین خنگ سوار کا اسم گرامی بھی ہے، وہ
حضرت سید وجیہ الدین مشہدی کے بھتیجے تھے، اور ان کے بعد ایبک کی طرف سے اجمیر کی ولایت پر
مامور کئے گئے، مگر حضرت خواجہ کی نظر توجہ سے ان کی حالت میں انقلاب آیا، وہ حکومت کے فرائض
کے ساتھ دین کی اشاعت کی بھی خدمت انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ ۶۰۷ھ میں جام شہادت
نوش فرمایا،

حضرت خواجہ اجمیریؒ نے اپنے خلیفہ ارشد حضرت مخدوم سید قطب الدین بختیار کاکیؒ کو دلی میں قیام
کرنے پر مامور فرمایا، سلطان ایبک کو ان سے استفادہ کا شرف حاصل تھا، دلی کی جامع مسجد قوۃ الاسلام

کی بنا و تعمیر اس نے ۵۹۲ھ میں کی، یہ اس عہد کی مشہور یادگار ہے، مسجد قطب صاحب ہی کی طرف منسوب ہو کر مشہور ہوئی،

شیخ یعقوب بن علی لاہوری اس عہد کے ممتاز ارباب فضل و صلاح میں سے تھے، ۵۳۵ھ میں لاہور تشریف لائے، ان سے ایک خلق کثیر نے رشد و ہدایت پائی، ۶۰۴ھ میں وصال فرمایا،

سلطان ایبک کے عہد حکومت کے یہی ممتاز علمار صلحائے امت تھے، اور انہی بزرگوں کے سایۂ شفقت کا یہ اثر تھا کہ ایبک خود بھی دینداری و پارسائی اور زہد و ورع سے مالامال ہوا[1]،

آرام شاہ ۶۰۷ھ

آرام شاہ ایبک کا لے پالک بیٹا تھا، لاہور کے فوجی افسروں نے ایبک کی وفات کے بعد اس کی بادشاہی کا اعلان لاہور میں کیا، مگر قسمت اس منصب کیلئے ایک دوسرے ترک نوجوان شمس الدین التمش (التتمش) کو منتخب کر چکی تھی، وہ قطب الدین کا عزیز خادم اور داماد اور اقطاع بدایوں کا گورنر تھا، دلی کے فوجی افسروں نے اس کو مدعو کر کے تخت پر بٹھا دیا، آرام شاہ نے ۶۰۷ھ میں دلی پر فوج کشی کی مگر وہ لڑائی میں مارا گیا اور آٹھ مہینے کے اندر اس کی حکمرانی کا خاتمہ ہو گیا،

شمس الدین التمش ۶۰۷ھ تا ۶۳۳ھ

شمس الدین التمش ترکی قبیلہ البری کا خان زادہ تھا، اس کا باپ ویلم اس قبیلہ کا ایک بڑا سردار تھا اور التمش سے غیر معمولی محبت رکھتا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کے

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۳۸ تا ۱۴۱، ۱۵۰، ۸۹، ۹۶، ۵۹، ۴۳، ظفر الوالہ ج ۲ ص ۳۳ تا ۶۸۶، تاج المآثر ص ۸۳، ۲۰۲، فخر الدین ص ۲۰، ۳۰، ۳۲، ۴۰، فرشتہ ج ۱ ص ۶۳، مرأۃ جہاں نما ص ۵۲، منتخب اللباب ج ۱ ص ۸۰، ۸۹، ۱۰۱، تا ۱۱۹، نزہۃ الخواطر ص ۹۹، (سوانح ایبک) ۳۱، (حسن نیشاپوری) ۲۱، (ترمذی) ۱۰۳، (محمودی) ۲۳۹، (کاشانی) ۱۹۶، (قاضی فاردہ) ۴۴، (رتن پشتی) ۲۳۴، (فرغانی) ۱۳۷، (حضرت خواجہ) ۲۴، (حضرت بخشی سوار) ۲۴۲، (لاہوری) موتس الارواح و تذکرۃ الصالحین وغیرہ، فونڈ آف مسلم رول ان انڈیا ص ۹۳ تا ص ۰۰، و تاریخ ہند سید ہاشمی، و تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ،

بھائیوں نے رشک و حسد سے اس کو ایک پردیسی کے ہاتھ فروخت کر دیا جس سے بخارا کے جمال الدین چست قبا نے اس کو خریدا اور بیچنے کیلئے غزنی کے بازار میں لایا، وہ خوش رو ترک بچہ تھا، جمال الدین نے گراں قیمت چاہی، شہاب الدین غوری نے اس کی خریداری کی ممانعت کر دی، پھر تیسرے سال ایبک کو اجازت دی کہ وہ غزنین کے حدود سے باہر جا کر اس کو خرید سکتا ہے، چنانچہ جمال الدین اس کو دلی میں لایا یہیں وہ خرید لیا گیا، غزنی میں اس کے خریدے جانے کی ممانعت اور دلی میں اس کی خریداری کے واقعہ کا پیش آنا گویا قدرت کو یہ ظاہر کرنا تھا کہ مستقبل میں وہ غزنی سے بے تعلق رہیگا، اور دلی ہی سے اس کو شرف توطن کا فخر حاصل ہوگا، چنانچہ اس نے ہندوستان ہی میں اسلام کی تعلیم مساوات کے ہاتھوں ترقی کی اور مسند حکومت پر بیٹھا،

اس نے غیر معمولی مشکلات کے ساتھ زمام حکومت ہاتھ میں لی تھی، آرام شاہ کے خاتمہ سے اس کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا، ایبک کا حریف ناصر الدین قباچہ ابھی زندہ تھا، اور خصوصاً ایبک کی وفات کے بعد ہندوستان کے تاج و تخت کیلئے جو سلطان شہاب الدین غوری کا ترکہ تھا، اپنے کو مستحق سمجھتا تھا، اس نے اپنی مملکت کو ملتان، بھکر، ٹھٹھ، کہرام اور سرسوتی تک وسیع کر لیا تھا، اور آرام شاہ کے بعد اس نے لاہور پر بھی قبضہ جما لیا تھا، اسی طرح ایبک کے دوسرے حریف تاج الدین یلدز نے بھی اس موقع کو غنیمت سمجھا، اور ایبک کے بعد دلی کے تخت کا دعویدار بنا، اور آگے بڑھ کر پنجاب کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا، دوسری طرف بنگال میں علی مردان خاں نے بختیار خلجی کے قتل کے بعد سلطان علاء الدین کے لقب سے اپنی بادشاہی کا اعلان اور اپنا سکہ اور خطبہ جاری کر دیا تھا، اسی طرح راجپوتوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا، اور جالور اور رنتھمبور وغیرہ اہم قلعوں کو قبضہ میں لے لیا تھا، اور خود پایۂ تخت دہلی بھی التمش کے مخالفوں سے خالی نہ تھا، آرام شاہ کے حمایتی افسروں کی سازشوں کا جال یہاں پھیلا ہوا تھا،

التمش نے اپنے حریفوں اور مخالفین پر جا بجا نگاہ ڈالی اور بڑی دانشمندی اور حکمت عملی سے راہ عمل طے کی، اس نے سب سے پہلے مغربی سرحد سے یکسوئی حاصل کرنے کیلئے تاج الدین یلدز کی طرف دست مصالحت بڑھایا، اور یلدز کو مطمئن کر کے قباچہ پر فوج کشی کی، اور ۶۱۲ھ میں لاہور اس سے چھین لیا، اس طرح اپنے

حدود حکومت مغرب میں شوالک پہاڑی اور مشرق میں بنارس تک رکھے اور ان کے انتظام میں مصروف ہوگیا، اس کے بعد جب مغربی سرحد پر خوارزمیوں نے اس کے حریف یلدز کو پسپا کیا، اور وہ لاہور میں آکر پناہ گزیں ہوگیا، اور ملتان بھٹنڈہ اور کہرام تک اس کے اثرات پھیلے تو اس موقع پر اس نے تاج الدین کے قصہ کو پاک کرلینا چاہا، چنانچہ اس پر فوج کشی کی اور اس کو گرفتار کرکے بدایوں کے قلعہ میں قید کردیا، جہاں اس نے وفات پائی، اس کے بعد قباچہ نے پھر لاہور پر قبضہ کرلیا، اور التمش کی فوج نے اس کو بھی زیر کرکے اس سے پنجاب کو خالی کرالیا، اور ۶۱۳ھ میں پہلی مرتبہ التمش کا گورنر پنجاب میں مقرر ہوسکا،

اس کے بعد ملک کے گوشہ گوشہ میں اس کی فتوحات اور اثر و نفوذ کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا، چنانچہ اس نے مشرق میں بنارس سے آگے بڑھ کر اڑیسہ کے راجہ جاج سنگھہ پر فوج کشی کی اور اس کو باجگذار بنایا، پھر ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء میں بنگال کی سمت گیا جہاں علی مردان خاں کے بعد حسام الدین عوض ملقب بہ سلطان غیاث الدین اپنا سکہ و خطبہ جاری کئے تھا، وہ مقابلہ کی تاب نہ لاسکا، نذر پیش کرکے اطاعت کی، التمش نے اپنے چھوٹے بیٹے ناصر الدین محمود کو بنگال کا گورنر بنایا، اور صوبہ بہار کو علحدہ کرکے ملک عز الدین کے سپرد کیا، غیاث الدین نے التمش کی واپسی کے بعد سر اٹھایا تو ملک عز الدین نے ۶۲۳ھ میں فوج کشی کرکے اس کا خاتمہ کیا، ناصر الدین محمود نے ۶۲۶ھ میں وفات پائی تو التمش ۶۲۷ھ میں تعزیت کے نام سے دوبارہ مشرقی بنگال گیا، اور ۶۲۷ھ میں علاء الدین خاں کو یہاں کی حکومت تفویض کی، مشرقی صوبوں سے یکسوئی حاصل کرکے وہ مشرقی راجپوتانہ کی طرف متوجہ ہوا، چنانچہ ۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء میں قلعہ رنتھنبور اور چتوڑ سر ہوئے، پھر مغربی راجپوتانہ میں قلعہ منڈور ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں فتح ہوا، اس کے بعد ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء میں سندھ پر حملہ آور ہوا، اور نہ صرف اوچھ قبضہ میں آیا بلکہ ناصر الدین قباچہ نے پسپا ہوکر دریا میں کود کر جان دیدی، اور پورا علاقہ سندھ پہلی مرتبہ دلی سلطنت کے ماتحت آگیا، اس طرح کوہستان سلیمان سے کوہستان کھاسی (آسام) تک اور ہمالہ سے بندھیاچل تک کا وسیع رقبہ مرکزی سلطنت دہلی کی عملداری میں آگیا، اسی طرح اس نے ۶۲۹ھ میں گوالیار اور ۶۳۱ھ میں مالوہ اور قلعہ بھیلسا پر اور ۶۳۲ھ میں اجین پر اقتدار حاصل کیا، اس طرح سلطنت دہلی کے جنوبی حدود دریائے نربدا تک وسیع ہوگئے،

غرض التمش ہندوستان میں ایک عظیم تر سلطنت کا بانی بنا، اس زمانہ کی رسم کے مطابق اس کے نام ہندوستان کی شہنشاہی کا پروانہ دربار خلافت بغداد سے بھی آگیا، گویا رسمی حیثیت سے ضابطہ کے ساتھ سلطنت غزنی سے اس کے جداگانہ وجود کی مزید تصدیق ہوگئی،

التمش نے ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء میں وفات پائی اور قطب صاحب کی مسجد کے پہلو میں دفن کیا گیا،

اخلاق و عادات

التمش نیک خو اور عدل پرور تھا، انصاف کیلئے خاص دربار میں مظلوموں کی فریاد سنتا، فریادیوں کو رنگین کپڑے پہن کر دربار میں آنے کی ہدایت تھی، رات کے ناگہانی حادثوں کیلئے زنجیر لٹکائی گئی تھی کہ اس کو اطلاع دی جاسکے، وہ صاحب علم و فضل اور علماء و ماہرین فن کا قدرداں، اور دیندار تہجد گذار اور صاحب زہد و ورع تھا، اور صلحائے امت کی خدمت میں حاضر رہنے کو سعادت کونین سمجھتا تھا،

التمش کا عہد حکومت "خوانین شمسیہ"

التمش کے طویل دور حکمرانی میں ہندوستان کی سلطنت کے استحکام کیلئے جو کوششیں عمل میں آئیں ان سے اس کا اور اس کے خاندان کا امتیازی وقار قائم ہوگیا، ملوک و خوانین اس کے جاں نثار بن گئے، یہاں تک کہ ۶۲۹ھ میں "خوانین شمسیہ" کے نام سے ایک جماعت کی تاسیس عمل میں آئی جس کو زمانہ حال کی اصطلاح میں دار الامراء کہا جاسکتا ہے، لیکن اس کے اختیارات دار الامراء سے زیادہ وسیع بلکہ موجودہ زمانہ کے لیجسلیچر کے ایوان عام کے اختیارات کے مانند تھے، اقتدار اعلیٰ جو التمش کے ہاتھوں میں تھا، اس کے استعمال کا حق رفتہ رفتہ اسی مجلس "خوانین شمسیہ" کے ہاتھوں میں آگیا تھا، التمش کے بعد یہی خوانین سلاطین کے عزل و نصب کے مختار بن گئے، وہ سلاطین کے انتخاب میں التمش کے خاندان یا اس کے موالی (آزاد کردہ غلام) کے انتساب کا لحاظ رکھتے تھے، اور اسی مناسبت سے بعض مورخین نے ان "خوانین شمسیہ" کے قائم کئے ہوئے سلاطین کو "سلاطین شمسیہ" کے نام سے موسوم کیا ہے،

وزراء

اس عہد کے ممتاز اہل علم منصب وزارت پر مامور کئے گئے تھے، وزارت عظمیٰ کے منصب پر نظام الملک قوام الدین محمد بن ابو سعد جنیدی سرفراز تھے، جن کے سامنے خلیفہ بغداد کا قلمدان وزارت بھی رہ چکا تھا، وہ ۶۰۷ھ

میں منصب وزارت پر سرفراز اور التمش کے پورے دورِ حکومت میں اس منصب پر مامور رہا، اس کے بعد اُس نے رکن الدین فیروز شاہ کی حمایت کی، اور اس کے خاتمہ کے بعد وہ بھی سیاست سے کنارہ کش ہو گیا، اسی طرح مولانا تاج الدین دبیری صاحب دیوان رسائل (انچارج سکریٹریٹ) تھے، بعض موقعوں پر قصائد بھی لکھے ہیں،

بہاء الملک تاج الدین حسن بن احمد اشعری المقتول ۶۳۶ھ جو سلطان ناصر الدین قباچہ کے وزراء میں تھا، اس کے زوال کے بعد التمش کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوا، وہ اپنے دور کے ممتاز اہلِ علم میں شمار کیا جاتا تھا، رکن الدین فیروز شاہ کے دور میں وزارت کے منصب پر مامور کیا گیا، اسی طرح عین الملک فخر الدین حسین بن احمد اشعری سلطان ناصر الدین قباچہ کے دربار میں ۶۰۲ھ سے ۶۲۵ھ تک منصبِ وزارت پر فائز رہا، اس کی موت کے بعد وہ بھی التمش کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوا، اس لئے اس کو رکن الدین فیروز شاہ کا اتالیق مقرر کیا اور اس کے عہد میں وزارت کے منصب پر مامور رہا،

شیخ الاسلام — اس عہد میں شیخ الاسلامی کے منصب پر مولانا جلال الدین سرفراز تھے، اُن کی وفات کے بعد مولانا نجم الدین صغری سرفراز کیے گئے، پھر آگے چل کر اپنے بعض اعمال کی بنا پر سلطان کے عتاب میں آئے، اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کو یہ منصب پیش کیا گیا،

قضاۃ — التمش کے عہد کے ممتاز قضاۃ میں قاضی سعد الدین کردری، قاضی حمید الدین ناگوری، قاضی نصیر الدین معروف بہ کاسہ لیس، قاضی جلال الدین، قاضی کبیر الدین اور قاضی قطب الدین کاشانی متوفی ۶۳۳ھ وغیرہ تھے،

علماء و فضلاء — اس دور کے ممتاز علماء و فضلاء میں ارباب مسند درس و کمال اساتذہ میں مولانا شرف الدین ابو توامہ حنفی دہلوی جن کے حلقۂ درس میں شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری بھی رہ چکے تھے، شیخ علی بن حامد کوفی، شیخ فخر الدین عمید تولکی جن کے بہترین قصائد بھی التمش کی شان میں ہیں، اور ملا جلال الدین وغیرہ تھے، اسی طرح اس عہد کے ممتاز ارباب قلم میں محمد بن محمد عوفی کا نام شہرت رکھتا ہے، اس نے اپنی مشہور کتاب لب الالباب، ناصر الدین قباچہ کے عہد میں وزیر عین الملک کے لئے تصنیف کی، جو گب میموریل کی طرف سے عبد الوہاب قزوینی کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ چھپ چکی ہے،

پھر اس نے التمش کے دربار میں پہنچ کر وزیر نظام الملک جنیدی کے نام اپنی دوسری کتاب جوامع الحکایات و لوامع الروایات معنون کی، اس کے دیباچہ میں التمش اور نظام الملک کے نام سے انتساب کرنے کا ذکر آیا ہے[1]، اسی طرح عوفی نے قاضی تنوخی متوفی ۳۸۴ھ کی الفرج بعد الشدۃ کو عربی سے فارسی میں منتقل کیا ہے،

شعراء — التمش کے عہد کے ممتاز شعراء میں بہاء الدین علی بن احمد جاجی کو امتیاز حاصل تھا، وہ صاحب سیف امراء میں سے تھا، جاج نگر کا قلعہ فتح کیا تھا، آگے چل کر التمش نے اس کو بدایوں کا امیر داد (مجسٹریٹ) مقرر کر دیا تھا،

مشائخ — اس عہد کے اکابر مشائخ طریقت میں سے حضرت مخدوم خواجہ سید قطب الدین بختیار کاکیؒ متوفی ۶۳۳ھ سے التمش کو غیر معمولی عقیدت تھی، التمش کے پورے دور میں حضرت کے وجود گرامی سے روحانی فیوض و برکات کا سرچشمہ جاری رہا، اور چشتیت کی سرمستی سے پورا ہندوستان سرشار رہا،

حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ ماوراء النہر کے قصبہ اوش میں پیدا ہوئے، ڈیڑھ سال کی عمر میں سایہ پدری سر سے اٹھ گیا، والدہ کے دامن تربیت میں پرورش پائی، پانچ سال کی عمر میں مدرسہ میں داخل کئے گئے، شیخ ابو حفص اوشی سے علوم کی تحصیل کی، اور ۱۸ سال کی عمر میں حضرت خواجہ سید معین الدین چشتیؒ سے دست بیعت ہوئے، اور اس عہد کے اکابر مشائخ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ اوحد الدین کرمانی، شیخ برہان الدین چشتیؒ اور شیخ محمود اصفہانی کے روبرو حضرت خواجہ معین الدینؒ نے انھیں اپنا خرقہ خلافت عطا فرمایا، کچھ دنوں کے بعد جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان تشریف لائے، تو انھوں نے بھی شوق دیدار میں ہندوستان کا سفر اختیار کیا، پہلی

---

[1] اگرچہ اس کا اصل فارسی نسخہ ابھی تک چھپا نہیں ہے، مگر کثرت سے نسخے موجود ہیں، ڈاکٹر نظام الدین نے اس پر اپنی محققانہ کتاب لکھی ہے، جو گب میموریل کی طرف سے چھپ چکی ہے، اور فارسی متن کی چیدہ حکایتوں کا اردو ترجمہ دو جلدوں میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے اختر شیرانی کے قلم سے منتقل ہو کر چھپ چکا ہے، فارسی متن کا ایک نسخہ دار المصنفین کے کتبخانہ میں بھی موجود ہے، سلطان مراد کے حکم سے جیسا کہ کشف الظنون میں ذکر آیا ہے ابن عرب شاہ متوفی ۸۵۴ھ نے اس کو ترکی زبان میں منتقل کیا، پھر بخاری متوفی ۹۱۴ھ سلطان محمد ثانی کیلئے اور صالح بن جلال الدین متوفی ۹۷۳ھ سلطان بایزید کیلئے ترجمہ کرتے گئے، پھر محمد بن اسعد تستری نے اس کا انتخاب بہ ترکی کیا،

منزل ملتان میں قرار پائی، یہاں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کا حلقۂ صحبت قائم تھا، حضرت جلال الدین تبریزی بھی ان دنوں یہیں تشریف فرما تھے، حضرت قطب الدین بھی کچھ دنوں یہاں قیام فرما رہے، پھر دہلی تشریف لائے، حضرت خواجہ اجمیری نے انھیں دہلی ہی میں قیام رکھنے کا حکم عطا فرمایا، اور یہاں ان کے فیوض و برکات کا سرچشمہ جاری ہوگیا، خود سلطان التمش کو ان سے غیر معمولی عقیدت پیدا ہوگئی، اس نے ہفتہ میں دو مرتبہ حضرت کی خدمت میں حاضری دینا اپنا معمول بنالیا اور ان کے فیض صحبت سے بہرہ اندوز ہوتا رہا، حضرت کی طرف سلطان التمش کے غیر معمولی رجحان کو دیکھ کر اس عہد کے شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو ان سے شکوہ پیدا ہوا، حضرت خواجہ اجمیری دو مرتبہ اجمیر سے اس عہد میں دہلی تشریف لائے، اور جب مولانا نجم الدین صغری نے حضرت خواجہ اجمیری سے حضرت قطب الدین کا شکوہ کیا، اور حضرت نے انھیں دہلی سے روانہ ہونے کا حکم فرمایا، تو سارا دلی فرط عقیدت سے حضرت کے نقش قدم کی خاک پاک کو اٹھا اٹھا کر سروں پر رکھنے لگا، حضرت خواجہ نے اہل دلی کی یہ عقیدت دیکھکر یہیں قیام رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی، کہ ایک دل یعنی شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو خوش کرنے کیلئے اتنے دلوں کو دکھایا نہیں جاسکتا، حضرت خواجہ اجمیری کے اس فیصلہ سے سلطان التمش کو بھی سکون خاطر حاصل ہوا، دہلی میں خلق خدا جس طرح پروانہ وار ان کے گرد اکٹھا ہوئی اس کی مثال اس سے پہلے نہیں گذری تھی،

حضرت پر وجد و مستی کا کیف طاری ہوتا تھا، وفات کا سانحہ بھی اسی سلسلہ میں پیش آیا، قوال حضرت جامی کی غزل گا رہا تھا جب اس شعر پر پہنچا،

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو حضرت پر وجد طاری ہوا، تین دن تک یہ کیفیت طاری رہی، قوال بھی شعر کو دہراتا رہا یہاں تک کہ واصل بحق ہوئے،

حضرت کی طرف دو کتابیں منسوب ہیں ایک تو ان کا فارسی دیوان ہے، دوسری فوائد السالکین کے نام سے ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جس کو ان کے خلیفہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر نے جمع کیا ہے،

شیخ نورالدین مبارک بن عبداللہ حسینی غزنوی، سلطان شہاب الدین غوری کے وقت سے صاحب منزلت مشائخ میں سے تھے، غزنی میں پیدا ہوئے، اور اپنے ماموں شیخ عبدالواحد بن شہاب احمد غزنوی سے تحصیل کی، پھر بغداد کا سفر کیا، حضرت شہاب الدین سہروردی سے فیض حاصل کیا، سلطان شہاب الدین غوری اپنی لڑائیوں میں جانے سے پہلے ان سے دعا کا طالب ہوتا تھا، اس نے شیخ الاسلامی کے منصب پر انھیں سرفراز کیا، یہ غزنی میں مقیم تھے، پھر ہندوستان تشریف لے آئے، سلطان التمش ان کی غیر معمولی تعظیم کرتا، صدر مجلس میں بٹھاتا، دست بوسی کرتا، اور اپنی مہموں میں ان سے دعاؤں کا طالب ہوتا تھا، ۶۳۲ھ میں انھوں نے وفات پائی، اور حوض شمسی سے مشرق میں قدیم دہلی میں مدفون ہوئے، (ص ۲۰۲)

اس دور کے ممتاز مشائخ میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کا درجہ بہت بلند ہے، وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے ہمعصر تھے، ۵۶۵ھ میں ملتان کے نواح میں پیدا ہوئے، عالم اسلامی میں علوم دین اور تصوف کے جو اہم مرکز تھے وہاں کسب و تحصیل فرمایا، اور ملتان میں اقامت اختیار فرمائی، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ اور ہندوستان میں سہروردی سلسلہ کے بانیوں میں سے تھے، ان کے فیض سے علم حدیث و علم طریقت کی روشنی پھیلی، خصوصاً سندھ و ملتان کا علاقہ ان کے فیوض و برکات سے مالامال تھا، اگرچہ ان کا قیام ناصر الدین قباچہ کے حدود حکومت میں تھا، اور قباچہ و التمش میں دیرینہ اختلاف قائم تھا، یہ التمش کو حق پر تصور کرتے تھے، اور ایک موقع پر جب قباچہ نے ایک سازش کا جال پھیلایا، اور التمش کو نقصان پہنچنے کا خطرہ پیدا ہوا تو حضرت بہاء الدین اور قاضی شرف الدین اصفہانی نے التمش کو خط لکھ کر آگاہ کردینا دینی فرض تصور کیا، مگر وہ مکتوب پکڑ لیا گیا اور قباچہ نے احتساب کیلئے دربار میں انھیں اور قاضی شرف الدین اصفہانی کو بلوایا، اور مکتوب کو قاضی اصفہانی کے ہاتھ میں دیکر جواب طلب کیا، وہ خاموش رہے، قباچہ نے اسی لمحہ جلاد سے انھیں تہ تیغ کرادیا، پھر وہ حضرت بہاء الدین زکریا کی طرف متوجہ ہوا، اور ان کے ہاتھ میں مکتوب کو رکھ دیا، حضرت نے فرمایا "میں نے اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے، یہ جواب سنتے ہی قباچہ پر لرزہ طاری ہوگیا، اور عزت و احترام

سے انہیں رخصت کر دیا، اس کے بعد جب شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ نے حضرت جلال الدین تبریزی پر شاہد کے گھر زنا کی تہمت لگائی تو سلطان التمش نے ملک کے علماء و صلحا کی ایک مجلس منعقد کی، حضرت بہاء الدین ذکریا بھی اس میں تشریف لائے، اور وہی اس مقدمہ کی سماعت کیلئے حکم بنائے گئے، جب حضرت تبریزی مجلس میں تشریف لائے، تو حضرت ذکریا ملتانی نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا، اور ان کی جوتیاں ہاتھوں میں اٹھالیں، یہ کیفیت دیکھ کر مطرب پر ایک عالم طاری ہوا، اور اس نے سازش کا پورا واقعہ مجلس میں بیان کر دیا، مولانا نجم الدین صغریٰ خجالت سے بیہوش ہوگئے، سلطان نے ان کو شیخ الاسلامی کے منصب سے برطرف کر دیا، اور حضرت بہاء الدین ذکریاؒ سے اس منصب کے قبول کرنے کی استدعا کی، جس کو انھوں نے قبول فرمالیا، ۶۶۶ھ میں واصل بحق ہوئے،

حضرت سید محمد بن علی حسینی بلگرامی اودھ کے مردم خیز قصبہ بلگرام کے ذی علم خاندان کے مورث اعلیٰ بھی اسی دور میں گذرے ہیں، وہ صاحب سیف مشائخ میں سے تھے، اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید تھے، ۶۲۳ھ میں بلگرام آئے اور اس علاقہ کو فتح کیا، ۶۲۷ھ میں ایک قلعہ یہاں تعمیر کیا، سلطان التمش نے جاگیر عطا کی، ۶۴۵ھ میں وصال فرمایا،

شیخ محمد بن محمد ترکمانی خواجہ عثمان ہارونی کے خلفاء میں سے تھے، ہندوستان میں تشریف لاکر نارنول میں اقامت اختیار فرمائی، ایک خلق کثیر ان کے ہاتھ پر اسلام لائی، ۶۴۲ھ میں وصال فرمایا،

اسی طرح حضرت قاضی حمید الدین محمد بن عطا ناگوری کا شمار بھی باکمال مشائخ طریقت میں ہے، ان کے والد حضرت عطا سلطان شہاب الدین کی معیت میں دہلی تشریف لائے، حضرت قاضی حمید الدین ناگوری المتوفی ۶۴۳ھ پہلے ناگور کی قضاءت پر سرفراز ہوئے، پھر بغداد پہنچکر حضرت سہروردی سے بیعت کی، اور واپس آکر حضرت خواجہ اجمیریؒ کی بارگاہ سے فیض اٹھایا، اور التمش کے دور میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی معیت میں دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی، اور خلق خدا

کو فیضیاب فرمایا، کتاب اللوائح اور کتاب طوالع الشموس ان کی یادگار ہیں،

اسی طرح اس عہد کے باکمال مشائخ طریقت میں شیخ علی بن احمد بن مودود چشتی ہیں، جن کے ذریعہ حضرت خواجہ اجمیریؒ کے واسطہ کے بغیر وہ اکیلا دوسرا سلسلۂ چشتیہ ہے جو ہندوستان میں جاری ہوا، اسی طرح شیخ سلیمان بن عبداللہ عباسی متوفی ۶۵۵ھ جو حضرت شہاب الدین سہروردی اور شیخ فرید الدین عطار کے صحبت یافتہ تھے، اور شیخ عزیز الدین لاہوری متوفی ۶۱۳ھ اور شیخ صلاح الدین حسن گنتھلی متوفی ۶۳۲ھ اس دور کے ممتاز اکابر مشائخ تھے،

ان بزرگوں کا یہ فیض کرم تھا کہ یہ دور تقویٰ، خدا ترسی، اور عبادت و ریاضت کیلئے اسقدر موزوں قرار پایا تھا کہ سلطان وقت التمش بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور یہ شاید عام نگاہوں میں نہ ہو کہ جس طرح مومنین کی صف میں وہ امتیاز رکھتا ہے، اور اس کے عہد کے سیاسی حالات سیاسی تاریخوں میں قلمبند کئے گئے ہیں اسی طرح اولیائے کرام کے تذکروں میں بھی ان کے پہلو بہ پہلو اس کا نام حسن عقیدت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مرید اور ان کا صحبت یافتہ تھا، اور اس کی اس جامعیت کا تذکرہ مورخین نے اس انداز میں کیا ہے:-

"ظاہر میں گو بادشاہ تھے، مگر دل فقیر تھا، ان کا قاعدہ تھا کہ کم کھاتے، کم سوتے، تمام شب بیدار رہتے، اپنے کسی کام کے واسطے غلام اور نوکروں کو تکلیف نہ دیتے، رات کو ڈول رسی پلنگ کے نیچے رکھتے کہ نماز تہجد کے ادا کرنے کے لئے جب اٹھیں تو خود پانی بھر لیا کریں کہ دوسرا بے آرام نہ ہو، اور آخر شب گدڑی اوڑھ کر شہر میں گشت کرتے، جس کو تکلیف ہوتی اس کو

رفع کرتے، علماء و صلحا کو بہت کچھ دیتے اور تھیلیوں
میں بھر کر پوشیدہ ان کے گھروں میں پھینک دیتے تھے۔

(باقی)

لہ طبقات ناصری ص ۱۶۵ تا ۱۷۹، ۱۶۳، ۱۳۵، ۲۳۰، ۱۵۹ تا ۱۶۱، ۳۴۳، ظفر الوالہ ج ۲ ص ۶۸۶ تا ۶۸۸، منتخب التواریخ ص ۶۷، تحفۃ الکرام ورق ۲۶۲، تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۵۳، الیٹ ج ۱ ص ۴۸۵، فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا، ص ۸۷ تا ۱۰۵، تاریخ ہند ہاشمی ج ۲ ص ۸، تاریخ ذکاء اللہ ج ۱ ص ۲۶۶ تا ۲۷۲، تذکرہ اولیائے ہند ج ۱ ص ۴۶، نزہۃ الخواطر ص ۶۴ (ذکر التمش) ۱۳۳ (تاج الدین دہلوی) ۱۳۵ (اشرف) ۱۴۲ (عین الملک) ۱۶۲ (کردری) ۱۶۳ (ابو قوامہ) ۱۸۲ (کوفی) ۱۸۷ (نوتکی) ۲۳۶ (کاسہ لیس) ۱۹۸ (کاشانی) ۲۳۵ (صغری) ۲۲۴ (عوفی) ۲۰۳ (نظام الملک) ۱۳۶ (کیتھلی) ۱۶۲ (عباسی) ۱۷۹ (چشتی) ۱۹۶ (کاکی) ۲۱۷ (ناگوری) ۱۵۷ (زکریا ملتانی) ۲۰۲ (نور الدین چشتی) ۲۲۷ (ترکمانی)

(سلسلہ تاریخ اسلام)

تاریخ صقلیہ جلد اول

اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی، اٹلی وجزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام، عہد بعہد کے دوروں کا عروج اور مسلمانوں کے مصائب اور جلاوطنی کا مرقع دکھایا گیا ہے، قیمت للعہ ۵۴۶ صفحے،

اردو زبان کی بناوٹ میں افغانوں کا حصہ

از جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی

(۳)

۱۳۴۔ افغانستان میں دستور ہے کہ کسی شخص کو دوسرے سے کوئی بات منوانا ہوتی ہے تو اس کے گھر میں دھرنا دے کر بیٹھ جاتا ہے، اور اس وقت تک نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے جب تک گھر والا درخواست قبول کرنے کی ہامی نہ بھر لے، یہ گویا آج کل کی ستیا گرہ ہے، موافق دستور اس قسم کی درخواست کا قبول کرنا فخر و مباہات ہی کا سبب نہیں ہوتا بلکہ ضروری بھی ہے، یہ ستیا گرہی وہاں "ننواتے" کہلاتا ہے،

رامپوری مستورات بھی کسی طرح نہ ماننے والی یا والے سے کہا کرتی ہیں کہ کیا ننواتے دیا تو ؤں (ننواتے) بھیجوں تب منو گی"؟

۱۳۵۔ قول قرار اور وعدے کو پشتو میں "نیغہ" کہتے ہیں، روہیل کھنڈ میں بھی اس کا رواج ہے،

۱۳۶۔ "نیغ" پشتو میں سخت یا اکڑے ہوئے کو کہتے ہیں، یہی معنی ہیغ کے بھی ہیں جب بیماری سے پٹھے سخت ہو جائیں اور انسان بمشکل حرکت کر سکے تو اسے "ہیغ نیغ" کہتے ہیں، رامپور میں بھی کسی کی گردن اکڑ جائے تو کہا جاتا ہے "گردن ہیغ نیغ ہے" اور حرکت نہ کر سکنے والا بھی اپنے آپ کو "ہیغ نیغ" کہتا ہے،

۱۳۷۔ "وار پہ وار"، پشتو میں بمعنی بار بار بولا جاتا ہے، رامپور میں بھی لوگ "وارے وار" یا "وار بے وار" بولتے ہیں،

رام پور کا ایک مخصوص محاورہ ہے، جب کسی سے کہنا ہوتا ہے "ٹھیرو" یا "انتظار کرو" تو یہاں کے مرد، عورت، عالم و جاہل، ہندو مسلمان سب کہتے ہیں "وار لو" یہ بھی غالباً پشتو اتہ ہی سے بنا ہے، افغانی

اس موقع پر "دار کرہ" بولتے ہیں،

۱۳۸۔ "داز"، پشتو میں کھلے ہوئے کو کہتے ہیں، یہ فارسی "باز" کی ایک شکل ہے، رامپوری مستورات کہا کرتی ہیں، "سارا گھر دار داز پڑا ہے" یہ محاورہ بھی افغانستان ہی سے آیا ہے،

۱۳۹۔ قوت، زور، لیاقت، مرضی، پسند، حکم، اثر وغیرہ بہت سے معنی کیلئے پشتو میں "داک" استعمال کیا جاتا ہے، روہیل کھنڈ میں بولتے ہیں "فلاں اپنے داک میں نہیں ہے" یعنی آپے سے باہر ہے،

۱۴۰۔ "وائے"، کسی اسم صفت کے آگے بڑھا دینے سے پشتو میں حاصل مصدر بن جاتا ہے، افغانی عزیز کو بمعنی رشتہ دار بھی بولتے اور رشتہ داری کیلئے "عزیز وائے" استعمال کرتے ہیں، رامپور میں "عزیز ولی" اور "پیارے ولی" بمعنی مذکور استعمال کرتے ہیں،

۱۴۱۔ "وخت"، پشتو میں وقت کو کہتے ہیں اور "وخت بہ وخت، وخت ناوخت اور بے وخت" وغیرہ صورتوں میں بولا جاتا ہے، رامپور کے عوام وخت بولتے اور ان سب ترکیبوں کو استعمال کرتے ہیں،

۱۴۲۔ پشتو میں "دِیر" بیای مجہول رونے پیٹنے اور سینہ کوٹنے کو کہتے ہیں، روہیلکھنڈی بھی اسے استعمال کرتے ہیں، اور کہتے ہیں "ارے یہ کیسا ویر ڈالا ہے"، یا "وہاں تو ایسا ویر پڑا تھا کہ خدا کی پناہ"

۱۴۳۔ "ہائے ہبتہ" یا "ہائی ہبتہ"، رامپور میں تباہ و برباد کو کہا جاتا ہے، عورتیں بولتی ہیں "فلاں چیز ہائے ہبتہ ہو گئی" یہ بھی پشتو کا ایک مرکب لفظ ہے، اس کا "ہائے" تو مشہور کلمۂ افسوس ہے اور "ہبتہ" پشتو میں ہیچ و پوچ، بیکار، اور بے فائدہ کے لئے بولا جاتا ہے،

۱۴۴۔ "ہِنگَٹ" رامپور میں قرعہ یا لاٹری کو کہتے ہیں، یہ پشتو "ہِنسک" سے بنا ہے، "ڈالنا" کے ساتھ بولا جاتا ہے،

۱۴۵۔ "یار" بمعنی دوست فارسی لفظ ہے، شاعر اس سے معشوق مراد لیتے ہیں، پشتو میں عاشق کو یار کہا جاتا ہے، رامپور میں مرد کا یار اس کا دوست اور عورت کا یار اس کا عاشق کہلاتا ہے، یہ عاشقی

کا مفہوم ظاہر ہے کہ پشتو سے آیا ہے،

۱۴۶۔ "یک ہماں"، پشتو میں ایک سا یا یکساں کا مترادف ہے، رامپور میں عورتیں کہا کرتی ہیں، "ایک ہماں کہے جاتی ہے کہ میں نے فلاں چیز نہیں لی"،

۱۴۷۔ پشتو کی ایک کہاوت ہے "جان پہ خیر ور، نہ زوئی نہ لور" یعنی اپنی جان پر مصیبت آجائے تو بیٹا بیٹی کوئی نہیں سوجھتا، یہ کہاوت بھی رامپور کی مستورات کی زبان پر آتی رہتی ہے، اتنا فرق کرتی ہے کہ "لور" (بمعنی بیٹی)، کو نور بولتی ہیں،

یہ روہیلکھنڈ میں مستعمل پشتو الفاظ کی مکمل فہرست نہیں ہے، مزید تلاش انھیں دوچند بنا دے سکتی ہے،

جب ڈیڑھ دو سو برس کے قیام میں پٹھانوں نے روہیلکھنڈ کی زبان پر اتنا اثر ڈالا ہے، تو دوسرے صوبوں پنجاب، سندھ، گجرات، دکن اور بنگال میں ان کے سیکڑوں برس کے رہن سہن اور میل جول کے اثرات کیوں نہ موجود ہوں گے،

میں مذکورۂ بالا صوبوں کی بولیوں سے ناواقف ہوں، اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ ان میں افغانی اثر کتنا ہے، اور نہ بتا سکتا ہوں کہ ان زبانوں کے محققین نے مذکورہ اثرات کا کھوج لگایا ہے یا نہیں؛ لیکن جہاں تک اردو کا تعلق ہے نہایت افسوس سے یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ ابھی تک ہمارے مورخین زبان اور لغت نویس اس حقیقت سے بیخبر نظر آتے ہیں،

آپ تاریخ ادب اٹھا کر دیکھیں تو اردو کی پیدائش کا سبب یا تو مطلق مسلمانوں کی آمد کو قرار دیا گیا ہوگا اور یا اس لفظ مسلمان کی تشریح عرب، ایران، ترک اور مغل سے کی گئی ہوگی، گویا کہ افغانی ہندوستان میں کبھی وارد ہی نہیں ہوئے، یا آئے تو مگر اتنے کم آئے کہ کسی شمار قطار میں نہیں ہیں، اور یا پھر یہ لوگ مسلمان ہی نہ تھے،

پہلی شق تو کسی طرح قابلِ قبول ہی نہیں، اس لئے کہ غزنوی، غوری، لودی اور سوری خاندانوں
کی یہاں سیکڑوں برس حکومت رہی ہے، اور ان ادبی تاریخوں میں تاریخی پس منظر کے طور پر یہ نام بھی
مندرج نظر آتے ہیں، ظاہر ہے کہ کسی مورخ کو بھی ان خاندانوں کے افغانی ہونے سے انکار نہیں ہے، تغلق
اور خلجی خاندانوں کے مورخین ضرور ترک بتاتے ہیں، بیشک یہ خاندان ترک غلاموں کی نسل سے ہیں، لیکن
بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو بادشاہ یا دس پانچ امیروں کے ماسوا حکومت کی ساری مشین وہی غوری ساخت
کی ہے اور عملہ و فعلہ میں افغانی یا افغانی النسل ہندی ہی عنصرِ غالب کی حیثیت رکھتے ہیں، اس صورت
حال کا مقتضی یہ ہے کہ افغانی نوواردوں کی تعداد کو ناقابلِ التفات بھی قرار نہ دیا جائے، رہ گئی آخری
شق، تو اگر ہماری سب ادبی تاریخیں مغل بادشاہوں کے عہدِ عروج میں لکھی گئی ہوتیں تو میں باور کر لیتا کہ
جس قوم کو مغلوں کے سیاسی مورخ "افاغنۂ ملاعنہ" اور "کفاران یوسف زی" لکھ رہے ہیں اسے ادبی
تاریخ نگاروں نے بھی "نامسلم" مان کر نظر انداز کر دیا ہے، مگر یہ کتابیں تو مغل سلطنت کے کمزور ہونے
یا مٹ جانے کے بعد انگریزوں کے "عہدِ معدلت مہد" میں تصنیف ہوئی ہیں، اس روشنی میں یہ اندھیرا!

بے توجہی کا سبب | میری نظر میں اردو اور افغانیوں کے علاقے کو نظر انداز کر دینے کی وجہ ایک تو اس
زبان کا "اردو" نام ہے اور دوسرے ہمارے ادیبوں کی پشتو زبان سے قطعی ناواقفیت

"اردو" ترکی زبان کا لفظ اور چھاؤنی کا مترادف ہے، "اردوی معلّیٰ" شاہی فرودگاہ کہلاتی
ہے، شاہجہاں نے نئی دلی آباد کی تو لال قلعہ اور اس کے حوالی اس ممتاز لقب سے پکارے جانے لگے،
ہند ہی میں نہیں دنیا کے ہر حصہ میں بادشاہ کی ذات مرکز ہوا کرتی تھی، لوگ رہنے سہنے، کھانے پینے،
اٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے ہر چیز میں "ان داتا" کی نقالی کو فخر جانتے تھے، عوام کی رسائی "ظل اللہ"
تک آج بھی نہیں ہوتی، یہ لوگ شاہی متوسلوں اور مقربوں کو جو کچھ کرتے دیکھتے اسے اختیار کرتے،
بدیسی لفظوں کے دیسی زبان میں داخلے سے اور بدیسی لہجے کی دیسی بولی میں تراش خراش

سے جو نئی بولی بنتی تھی، شاہجہاں اور عالمگیر کے اردوی معلّیٰ میں بھی نوازی جانے لگی، ولی دکنی کا دیوان
دیکھ کر دلی والوں نے بھی سنجیدگی سے اپنی بولی میں طبع آزمائی شروع کی، خود اردوی معلّیٰ کے ناخداؤں
شاہزادوں اور سلاطین نے بھی اس زبان میں کہنا شروع کیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دلی کے اس شاہی علاقے
کو ادبی مرکزیت بھی حاصل ہو گئی، جب کسی لفظ یا محاورے کو "محاورۂ اردوی معلّیٰ، اصطلاحِ اہلِ اردو
متعارف اردوی بادشاہی، اصطلاحِ شاہجہان آباد" یا "عرفِ اردوی بادشاہی" کہدیا جاتا، بحث
کرنیوالا گردن جھکا دیتا، خانِ آرزو اکبرآبادی نے ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) کے قریب اردو لغت پر
ایک کتاب "نوادر الالفاظ" لکھی تو اس میں عبدالواسع ہانسوی کی اردو لغت "غرائب اللغات" کے
مقابلہ میں حجتِ قاطع کے طور پر یہی مذکورۂ بالا الفاظ استعمال کئے تھے[1]،

جب اردو شاعری نے عوام میں زیادہ مقبولیت حاصل کی تو جو لوگ محاورۂ اردوی معلّیٰ سے ناواقف تھے مجبور ہوئے کہ اس کے
ماہروں کو اپنا کلام دکھائیں اور اس طرح مشاعرے میں گنوار یا قصباتی کے دلخراش اعتراض کا نشانہ بننے سے اپنے آپ کو بچا سکیں[2]،

---

[1] ملاحظہ ہو نوادر الالفاظ قلمی، ۱۶۴ اب و ۲۰۲ اب و تحت لفظ بود لی، میر تقی میر اور گردیزی نے اپنے تذکروں
کے دیباچہ میں "زبان اردوی معلّیٰ" سے اور قائم نے "مخزن نکات" میں "محاورۂ اردوی معلّیٰ" کہکر یہی اردو زبان
مراد لی ہے، بادشاہ کی ذات کے مرکزِ زبان ہونے کے متعلق انشاء نے دریائے لطافت ص ۱۰۵ میں لکھا ہے کہ

"منبع فصاحت و معدن بلاغت کہ زبان شان مشہور بہ اردو ست، سواری
بادشاہ ہندوستاں کہ تاج فصاحت بر سر او می زیبد، چند امیر و مصاحبان شان
و چند کس دیگر و چند زن قابل از قسم بیگم و خانم و کسبی ہستند ہر لفظی کہ در یں ہا استعمال یافت زبان اردو شد"

[2] خان آرزو دہلی کے اردو شاعروں کے پہلے استاد تھے، وہ جس لفظ کو کہہ دیتے کہ ہم اردوی معلّیٰ کے باشندے یوں نہیں بولتے
تو سننے والے اسے تسلیم کرنے پر مجبور تھے، نوادر الالفاظ میں بھی ایک جگہ انھوں نے لفظ "چھنیل" کے تحت لکھا ہے کہ

"ما مردم کہ از اہل ہندیم و در اردوی معلّیٰ می باشیم نشنیدہ ہ"

دلی کے بہت سے استاد لکھنؤ گئے تو وہاں بھی اس خاص محاورہ کی قدر کی گئی، پورب والے خود اپنے حاکم نہ تھے، ان پر جو لوگ مسلط ہوئے تھے وہ سب دلی کے دربار کے متوسل اور مغلی طور طریق کے دلدادہ تھے، یہ دلی دیار کے رہنے والے شاعر بھی ان ہی کے حضور میں تقرب حاصل کرتے اور انھیں کی ادبی مجلسوں کو گرمانے کی خدمت انجام دیتے تھے، اہل پورب بالکل اسی طرح جس طرح ہم انگریز کی نظر میں اپنی وقعت بڑھانے کیلئے بالکل انگریز بن جانا چاہتے تھے، ان دیسی مغربی حاکموں کی نقل کو ذریعۂ قدر و منزلت جانتے تھے، زبان کے معاملہ میں بھی انھوں نے "محاورۂ اردوئے معلیٰ" ہی کے اتباع کو اپنا شیوہ بنایا، اور شاعری شروع کی تو اس میں بھی دلی والوں ہی کو استاد بنایا، ورنہ ڈر تھا کہ مجلس مشاعرہ میں اہل مغرب اہل مشرق کو "پوربیا" جان کر ہنسی اڑائیں گے، اس طور پر زبانِ اردوئے معلیٰ کا لقب لکھنؤ میں بھی زبان زد ہوگیا، مگر کچھ تو لفظی طوالت کے باعث اور کسی قدر دلی کی سیاسی قوت کے انحطاط سے "معلیٰ" کا لقب بول چال میں کم آنے لگا،

لکھنؤ اور دہلی دونوں اب دو مختلف دبستان ادب بن چکے تھے، اور ان مرکزوں سے دور رہنے والے ڈاک کی بڑھتی ہوئی سہولتوں کے باعث گھر بیٹھے یہاں کے اساتذہ سے اصلاح لینے لگے تھے، اس شکل سے زبان اردو کا پرچار تقریباً تمام ہندوستان میں ہوگیا، اب اس نام میں کچھ اور تخفیف ہوگئی، اور لوگ صرف "اردو" کہکر اس سے زبانِ اردوئے معلیٰ مراد لینے لگے،[۱]

جب انگریزوں نے ملکی مصلحت سے اس زبان میں کام شروع کیا تو حسب دستور اس زبان کے پیدا ہونے کے اسباب پر بھی غور کیا گیا، اس سلسلہ کا غالباً سب سے پرانا کسی ہندی کا بیان میر امن دہلوی کا ہے، وہ باغ و بہار کے دیباچہ میں جو ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں ختم ہوئی تھی لکھتے ہیں:-

---

[۱] انشا نے بھی دریائے لطافت میں بادشاہ دہلی کو منبع فصاحت قرار دیتے ہوئے انکی زبان کا نام صرف اردو تھا یا ہے ملاحظہ ہو ص ۱۵، مگر عام طور پر "اردو" کا زبان پر اطلاق انگریزی دور کی بات ہے گو خود انگریز اسے ہندوستانی کہتے اور کہلوانا چاہتے تھے،

"حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منھ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوستان کے کے نزدیک جوگی ہے، وہاں کے راجہ پرجا قدیم سے رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے، ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا، سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے، اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی، آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا آتا ہے ہندوستان کو لیا، ان کے آنے اور رہنے سہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا،

پھر ہمایوں بادشاہ پٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہوکر ولایت گئے، آخر وہاں سے آن کر پس ماندوں کو گوشمالی دی، کوئی مفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے،

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئی، لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی،

جب حضرت شاہجہانِ صاحبقران نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا، اور تخت طاؤس میں جواہر جڑوایا، اور دل بادل سا خیمہ چوبوں پر استاد کر طنابوں سے کھچوایا، اور نواب علی مردان خاں نہر کو لیکر آیا، تب بادشاہ نے خوش ہوکر جشن فرمایا، اور شہر کو اپنا دار الخلافت بنایا، تب سے شاہجہان آباد مشہور ہوا، اگرچہ دلی جدی ہے، وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے، اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ خطاب دیا، امیر تیمور کے وقت سے محمد شاہ کی بادشاہت بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تک پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی، ندان زبان اردو کی منجھتے منجھتے ایسی منجھی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی،"[۱]

[۱] باغ و بہار ص ۳، مطبع مصطفائی لکھنؤ ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء

میر امن کا یہ بیان حقیقت سے بہت قریب تھا مگر اس کا یہ جملہ کہ "تیمور کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا" غمازی کرتا ہے کہ خود ان کا عقیدہ یہی تھا کہ اردو مغلوں کی خانہ زاد ہے، یہی باعث ہے کہ اس کی تالیف سے ۵ سال بعد انشا نے "دریائے لطافت" میں اردو کی پیدائش کے اسباب بتاتے ہوئے میر امن کے اس عقیدے کو دہرایا، فرماتے ہیں:[1]

"در ہر مملکت قاعدہ این است کہ صاحب کمالان و خوش بیانان آنجا در شہری کہ قرارگاہ ارکان دولت پادشاہی باشد جمع شوند و از کثرت ورود مردم ہر دیار برائے تحصیل قوت در آن بلدہ باشندگانش در تحریر و تقریر بہ از ساکنان بلاد دیگر آن ولایت باشند......

چون بیشتر مجاری علیہ سلاطین تیموریہ دار الخلافہ شاہجہان آباد بودہ است و فصیحان و بلیغان و علمائے عالی قدر فریقین و دیگر ارباب فنون لطیفہ و اصحاب علوم شریفہ در آن شہر دلنواز آرامگاہے برائے خود ساختہ بودند. خوش بیانان آنجا متفق شدہ از زبانہائے متعدد الفاظ دلچسپ جدا نمودند و در بعضی عبارات و الفاظ تصرف بکار بردہ زبانی تازہ سوائے زبانہائے دیگر بہم رسانیدند و بہ "اردو" موسوم کردند،

بالجملہ زبان اردو مشتمل است بر چند زبان یعنی، عربی و فارسی و ترکی و پنجابی و پوربی و برجی وغیر آن"

اسی زمانے میں سید احمد علی خاں یکتا نے قواعد اردو پر ایک کتاب "دستور الفصاحت" نام سے لکھی تھی، اس کے مقدمے میں اردو کی تعریف اور سبب حدوث حسب ذیل لکھا ہے:-

---

[1] دریائے لطافت: ۱۴

"درین رسالہ کہ صرف و نحو زبان ہندی دران بیان نمودہ می شود، نہ مراد مولف تحقیق زبانہائے کثیرۂ مذکورہ است، بلکہ مقصود و مطلوب ازان دریافت صحت الفاظ خاص و معلومات ترکیب معینۂ کلامی است کہ مختص و موضوع بہ "محاورۂ اردوئے معلی" باشد و بس زیرا کہ بنائے تقریر و تحریر تمام اعزۂ عالی مقدار و مدار کلہ و کلام جمیع شرفا و نجبائے نامدار و شعرائے ذوی الاقتدار کہ فی زماننا بر مسند اعتبار جا دارند، بر ہمین محاورہ موقوف است،

"اردو عبارت است از زبانے کہ بعد اختلاط و ارتباط الفاظ پنجابی و میواتی و برج کہ زبان اضلاع قرب و جوار دار الخلافہ شاہجہان آباد است، با کلمات فارسی و عربی و دیگر زبانہا از کسر و انکسار ثقالت و سخافت اصلی ہر لغت باصلاح صحبت ہمدگر مثل کیفیت متوسط کہ باعتقاد اطبا در مرکبات از معاجین وغیرہ حادث می گردد، پیدا شدہ ساتر عیوب جمیع زبانہائے ممزوجہ گردیدہ است، و بمرتبہ حسن و لطافت دران یافتہ میشود کہ از روے متانت و وجہ لطافت و فصاحت پہلو بعربی می زند و بکمال صفا و عذوبت بر فارسی تفوق می جوید،

و سبب حدوث این زبان نفیس این است کہ چون سواد اعظم ہندوستان و منابع این زمین منفعت بنیان نسبت بالاقالیم دیگر افزون و زیزنی این ملک باکناف جہان ہویدا و اشہر، و نیز پایۂ سلاطین و امرای این کشور از شوکت و ثروت و ہمت و سخاوت رفیع و منیع تر از عمائد دولت و ارکان سلطنت اقالیم دیگر است بالضرورہ دانایان ہر دیگر و عاقلان عصر و کاملان ہر فن و ہنر از فضلا و علما و شعرا و نجبا ہر جا کہ بودند از اطراف عالم و اکناف جہان رو باین سواد اعظم مراد توام آوردہ، بمقاصد و مرادات دلخواہ رسیدند و اکثری از آنہا ہمین زمین ارم تزئین توطن ورزیدند، پس از سبب د

آمد و شد در بار و پیش آمدن معاملات با مردم ایں دیار از حرف زدن باین لغت چارہ ندیدند، ناگزیر دریں صحبت اینہا از آنہا و آنہا از اینہا در حین مکالمہ بقدر کفایت از الفاظ ہمدیگر اخذ نمودند و کار بہ می آوردند،

چوں مدتے بریں نحو گذشت و عمرے صرف شد، از امتزاج الفاظ و ارتباط کلمات در یک دیگر حالے بہم رسید کہ آں را زبان تازہ تواں گفت، چہ نہ عربی عربی ماند و نہ فارسی فارسی و ہمیں قیاس ہر بھاکا از زبانہائے مروجہ ہندی نیز بر اصل خود نہ ماند، عقلاو دانایان چنیں قرار دادند کہ کلمات سنجیدہ و الفاظ پسندیدہ از ہر زبان و ہر محاورہ کہ باشد بصحت و درستی ازاں برچیدہ بوضعے کہ مفید مطالب بآسانی و دور از تنافر و ثقالت زبانی بود، در کلام می آمدہ باشد۔۔۔ د موافق ہمیں قاعدہ کہ ضبط گردیدہ بود در بار سلاطین و امراء و بارگاہ خواقین و وزراء ہمہ نجبا و شرفا بیک دیگر حرف میزدہ باشند،

چوں صورت شاہد ایں مطلوب بر غرفۂ استحسان جلوہ گری نمود، نام ہمیں محاورۂ خاص بہ "اردوی معلی" شہرت گرفت"۔[1]

اس بیان میں بھی کہیں کہیں حقیقت کی جھلک ہوتے ہوئے وہی بنیادی خیال دہرایا گیا ہے کہ یہ نئی زبان دہلی کے اندر مغلوں کے عہد سلطنت میں پیدا ہوئی ہے،

مرزا مختار علی بیگ (مدرس اول آگرہ کالج) نے اپنی کتاب "رسالہ قواعد اردو" حصۂ سوم میں ماہیت اردو زبان کے تحت ۱۸۶۹ء کے قریب لکھا ہے،

"اردو کے معنی بادشاہی لشکر کے ہیں، چنانچہ تواریخ کی کتابوں میں بادشاہی فوج کو

---

[1] دستور الفصاحت ص ۳، ۵ طبع رام پور

اردوی معلی لکھا ہے جب سلاطین تیموریہ نے ہندوستان میں قیام کیا، اور دہلی کو اپنا دار الخلافہ بنایا تو لشکر کے آدمی اور بادشاہی متوسل جو ایران اور توران اور مختلف ملکوں کے رہنے والے تھے، سودا سلف خریدنے میں دہلی کے بازاریوں کے ساتھ جن کی زبان ہندی بھاشا تھی، فارسی ہندی آمیز بولنے لگے، رفتہ رفتہ شاہجہاں کے عہد تک ہر ایک بولی غلط ملط ہو کر ایک نئی زبان پیدا ہو گئی، اور اس کا نام اردوی معلی سے منسوب ہو کر "زبان اردو" ہو گیا، اور کثرت استعمال سے لفظ زبان دور ہو کر صرف اس زبان کا نام "اردو" رہ گیا۔

اردو زبان لغات ہندی فارسی اور عربی، ترکی، سنسکرت وغیرہ سے مرکب ہے، اور جب سے عملداری سرکار دولت مدار کمپنی انگریز بہادر کی ہندوستان میں آئی، تب سے صاحبان عالیشان حکام زماں کے التفات سے اس نے ایک عجیب رونق پائی، بلکہ اکثر کچہریوں میں ہر طرح کے کاغذات مقدمات دیوانی اور کلکٹری اور فوجداری وغیرہ اردو ہی زبان میں لکھے جاتے ہیں، اور اردو محاورے میں اب لغات انگریزی بھی مثل لغات فارسی اور عربی کے شامل ہوتے جاتے ہیں"۔[2]

اس بیان میں بھی وہی میر امن کی رائے کا اعادہ ہے اور بس اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ آب حیات اور اس کے بعد کی تمام تصنیفات میں یہی نقطۂ نظر مرکزی خیال نظر آتا ہے، اور خود ان سب محققین کے یہ ظاہر کر دینے کے باوجود کہ اردو دراصل ایک مقامی زبان یا محاورے کا نام ہے، جس نے دہلی کے لال قلعے اور اس کے آس پاس کے چند محلوں میں پرورش پائی، اور شعر و شاعری کے پروں سے اڑ کر ہندوستان کے تمام حصوں کی ادبی بولی بنی، مورخین زبان کے دماغ سے مغل کسی طرح

---

[2] رسالہ قواعد اردو حصہ سوم ص ۱-۳ مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۶۹ء

نہ نکل سکے ہ۔[1]

حکیم شمس اللہ صاحب قادری حیدرآبادی نے میر امن دہلوی کے بیان کے ابتدائی حصے کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر یہ ثابت کیا کہ جس کو میر قائم اور گردیزی وغیرہ دکھنی زبان کہا کرتے تھے وہ دراصل یہی مسلمانوں کے "اردو" ہندوستان کی پیداشدہ زبان ہے، صرف مقامی لفظوں اور محاوروں کے دخل نے اسے اردوی معلیٰ شاہجہان آباد کے محاورے سے ممتاز کر دیا ہے،

حکیم صاحب کے بعد سید نصیر الدین ہاشمی صاحب نے "دکن میں اردو" لکھ کر اس موضوع کی تکمیل کر دی، مگر ان کے طرزِ بیان سے اس مسئلے نے صوبہ واری سوال پیدا کر دیا، اور مرحوم محمود خاں شیرانی نے "پنجاب میں اردو" لکھ کر یہ ثابت کیا کہ اردو کی جنم بھومی دکن نہیں پنجاب کا علاقہ ہے،

اس چھان بین ہی کا غالباً یہ مبارک نتیجہ ہے کہ بعد کی دو تین کتابوں میں مسلمانوں کی تشریح کے اندر

---

[1] انشاء نے دریائے لطافت (ص ۹۴) میں اس بولی کے مستند محلوں اور ان کے حدود اربع کا اس طرح ذکر کیا ہے،

"مکانی کہ دران مجمع فصحا ست قلعۂ مبارک بادشاہی است و در محلۂ دیگر یکی بنگلۂ سید فیروز کہ از خانۂ میرزا اسم مرثیہ خوان متوفی تا حویلی اسماعیل خان صفدر جنگی و از انجا تا حویلی ملکۂ آفاق حضرت ملکہ زمانیہ بنت فرخ سیر بادشاہ یک ضلع محسوب است بلکہ نزد بعضی کابلی دروازہ و بیرون آن نیز تا تکیۂ شاہ خدایار داہنی طرف از حویلی نواب شیر جنگ مرحوم و چوک نواب سعادت خان بہادر برہان الملک جنت آرامگاہ تا بنگاہ جبش خان داخل آن باشد، لیکن درین مقام تاملی است، آن چہ شک را دران گنجایش نیست، این است کہ تا حویلی ملکۂ آفاق فصاحت از در و دیوار می بارد، و از جیلی قبر تا ترکمان دروازہ یک طرف و تا دہلی دروازہ کہ بدہلی دروازہ شہرت دارد یک طرف و تا چوک سعد اللہ خان طرف دیگر و حویلی و بازار نواب امیر خان مرحوم و سہ راہہ بیرم خان کہ بہ ترا ہہ مشہور است و محلہ فولاد خان و کوچہ چیلیاں جزو دہلی دروازہ است"۔

سب سے آخر میں یہی مگر "افغان" بھی نظر آجاتا ہے،[1] مگر سچ پوچھیے تو یہ بھی کسی تحقیق کے نتیجہ کا اثر نہیں معلوم ہوتا بلکہ حقیقت اپنے ظہور کے لئے بیتاب سی نظر آتی ہے، جس کے باعث از خود ان حضرات کے قلم سے تابع مہمل کے طور پر یہ لفظ نکل گیا ہے،

اس بے توجہی کا دوسرا سبب پشتو زبان سے ناواقفیت ہے، یہ مرض بہت پرانا اور عام ہے، عبدالواسع ہانسوی سے لے کر آج تک کسی ایک لغت نویس، ایک قواعد نگار یا ایک مورخ زبان نے بھی اردو اور پشتو کے علاقے پر روشنی نہیں ڈالی، یہ سب نہیں تو ان میں سے بیشتر حضرات ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے کم و بیش آگاہ ہیں، اس لئے کم از کم مسلمان افغانوں کی آمد ہند اور اس کے ہر قسم کے اثرات کو جانتے ہوئے اردو زبان پر افغانی بولی کے اثر سے کلی بے توجہی کی توجیہ، چھوٹا منہ بڑی بات ہے، مگر کچھ بغیر نہیں بنتی کہ سوائے عدم واقفیت کے اور کیا کی جا سکتی ہے،

هندوستانیوں میں انشاء اللہ خاں اور انگریزوں میں گریرسن پشتو سے کما حقہ واقف تھے، ان دونوں نے اردو زبان پر کام بھی کیا ہے، مگر تعجب ہے کہ یہ بھی اس مسئلہ پر مطلق روشنی نہیں ڈالتے،[2]

راورٹی کی رائے غالباً سب سے پہلے جس شخص نے اس طرف واضح اشارہ کیا ہے وہ پشتو کا انگریز عالم کرنل راورٹی ہے، "پشتو انگریزی لغت" کے دیباچہ میں اس نے لکھا ہے،

"یہ حقیقت ہے کہ پشتو زبان میں بہت سے لفظ ایسے ملتے ہیں جو اردو میں بھی نظر آتے ہیں، مگر جبکہ ان سب کا واضح طور پر سنسکرت میں سراغ نہیں ملتا ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو دھیریندر ناتھ ورما کی تاریخ ادب ہندی ۔۔۔۔ اور قادری صاحب کی داستان تاریخ اردو ص ۔۔

[2] گریرسن کی کتاب "ہندوستان کی لسانی پیمائش" ہندوستانی لسانیات پر انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، مجھے اس کتاب کے خود دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا ہے، اس لئے جو کچھ اس کے متعلق اوپر لکھ چکا ہوں اس میں ترمیم کر دوں گا، اگر گریرسن پشتو اور اردو کے تعلق پر رائے زنی کر چکا ہو،

کم از کم اس وقت تک کہ انھیں کسی اور اصلی زبان کا ثابت کیا جائے، خالص پشتو اصطلاحیں سمجھنے کی طرف مائل ہوں، جو بالکل اسی طرح ریختہ میں شامل ہو کر گھل مل گئی ہیں، جیسے سنسکرت، عربی، فارسی وغیرہ، بلکہ پرتگالی اور ملیالم کے لفظ،

یہ صورت واقعہ ذرا بھی تعجب انگیز نہ ہوگی، جب ہم یہ پیش نظر رکھیں گے کہ بارہویں صدی عیسوی میں محمود غزنوی کے حملے سے افغانوں نے ہندوستانی جزیرہ نما کے تعمیر میں کیا نمایاں پارٹ ادا کیا ہے، یعنی ان کی پیہم اور مسلسل درآمد، ان کی فتوحات اور یہاں مستقل آبادیاں اور یہ حقیقت کہ دیسیوں میں شادی بیاہ کر کے انھوں نے اپنی اولاد چھوڑی ہے جو "ہندوستانی پٹھان" کہلاتے، ابھی تک ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ شمار ہوتے اور تقریباً سب کے سب اردو بولتے ہیں، ان کی مہاجرت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ کچھ قبیلے اور خاندان افغانستان سے بالکل غائب ہو چکے ہیں، اور ان کے اخلاف صرف ہندوستان ہی میں پائے جاتے ہیں"[1]

یہاں سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ اردو اور پشتو میں جو لفظ مشترک نظر آتے ہیں انھیں پشتو ماننے کے بجائے اردو اور خود پشتو میں ان کا داخلہ اردو کے ذریعہ کیوں نہ تسلیم کیا جائے، راورٹی نے اس کا جواب حسب ذیل دیا ہے،

"یہ امر بھی لوگوں کے پیش نظر نہیں معلوم ہوتا کہ اردو مقابلۃً بہت نئی زبان ہے، اور دہلی کی سلطنت کی بنیاد پڑنے پر جہاں یہ ہمیشہ بالکل خالص اور

[1] پشتو انگریزی لغت (دیباچہ ص ۱۴، ۱۵)

ترقی یافتہ رہ چکی اور اب تک بھی ہے، شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں بنی کر، کیونکہ اسی کے وقت سے ہندوستانی ادب کی طرف توجہ شروع ہوئی، اور اسی کے برسر حکومت آنے کے بعد سے ان خالص اسلامی علوم کا زوال شروع ہوا، جو پچھلی حکومتوں میں نشو و نما پا چکے تھے، میرے قبضہ میں پشتو کی بہت سی کتابیں ہیں، جو اکبر سے بہت برسوں پہلے اور خود اس کے عہد حکومت (۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۴ء تک) کے دوران میں تالیف ہوئی تھیں، حالانکہ اردو کا سب سے پہلا مصنف جس نے اردو بولی میں لکھا ہے، ولی شاعر ہے، جو سترہویں صدی کے وسط میں گزرا ہے، اور شیخ مالی یوسف زئی سے ۲۳۳ برس متاخر ہے، جس نے ۱۴۱۷ء میں یوسف زئیوں کی فتح وادی پشاور وغیرہ کی تاریخ لکھی تھی،

یہ سب سے پرانی کتاب ہے جس کا مجھے کھوج ملا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلنا چاہئے کہ اس سے پہلے پشتو ادب کا وجود نہ تھا، اس کے برخلاف اخون درویزہ اپنی فارسی کتاب "تذکرۃ الابرار" میں لکھتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں "صراح" نام کی ایک مشہور کتاب یوسف زئی قبیلے کے پاس تھی جو صدیوں سے ان کے قبضہ میں چلی آتی تھی اور یہ لوگ اسے ہمیشہ سے بڑی وقعت و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، پشتو زبان میں ایک اور تاریخ خان کاجو رانی زئی نے ۱۳۹۴ء میں لکھی تھی، خود اخون درویزہ نے اردو کی سب سے پہلی تصنیف سے سو برس قبل اپنی "مخزن پشتو" لکھی تھی... اس کتاب میں انھوں نے پشتو کے ان مصنفوں کے بھی حوالے دیئے ہیں جو ان سے پہلے گزر

چکے تھے، بنا بریں یہ واضح ہے کہ پشتو تحریری زبان کی حیثیت سے اردو کے بننے سے سیکڑوں برس پہلے وجود میں آچکی تھی، باقی یہ حقیقت کہ پشتو بہت پرانی بولی ہے اس سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا،

دوسری بولیاں، گجراتی اور دکھنی زبانیں تقریباً اردو ہی کے ساتھ پھوٹی ہیں، ان کا زیادہ تر مدار عربی اور فارسی پر ہے، مگر یہ نئی زبان نہیں بن سکیں[1]

میری رائے چونکہ یہ امر بایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ تیموری مغلوں کی آمد ہندوستان سے صدیوں پہلے اس زبان میں جو آگے چل کر اردو کہلائی، نثر اور نظم ہر قسم کی تالیفات معرض وجود میں آچکی تھیں، اس لئے راورٹی کے اردو کی عمر کے تخمینے کو میں بھی نہیں مانتا، لیکن میری نظر میں اس کا بنیادی خیال نہ صرف ناقابل تردید ہے بلکہ جیسا کہ میں اس مقالہ کی تمہید میں از روئے حقایق تاریخی بیان کر چکا ہوں، متقاضی ہے کہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا جائے، چنانچہ میں یہ کہتا ہوں کہ اردو زبان کی پیدایش کا سب سے بڑا سبب ہندوستان میں افغانوں کی آمد تھی، اور اس نئی زبان میں عربی، فارسی، ترکی اور مغلی الفاظ کا سب نہیں تو بہت بڑا حصہ بھی افغانوں ہی کی زبان اور ان ہی کی وساطت سے داخل ہوا ہے، خود ان زبانوں کے بولنے والوں کے ذریعہ سے بہت کم لفظ یہاں آئے تھے،

اس خیال کی تائید میں دو باتیں پیش کرتا ہوں، پہلی یہ کہ افغانستان کی جائے وقوع کا تقاضا یہ تھا کہ اس پر قبضے کیلئے ہندی، ایرانی اور تورانی سب کوشش کریں اور یہ ناممکن تھا کہ اتنا چھوٹا سا ملک برابر اپنی حفاظت کر سکے، اس لئے اس کے مشرقی علاقے ہندیوں کے اور مغربی ایرانیوں اور ترکوں کے زیر اثر رہ چکے تھے، اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اس ملک کا وہ حصہ جو ایران سے ملحق تھا، فارسی بولتا

---

[1] پشتو انگریزی لغت ص ۱۵، ۱۶

تھا، اور جو لوگ ہندوستان سے قریب تھے وہ سنسکرت اور پراکرت سے متاثر تھے، صرف درمیانی علاقہ کے باشندے اپنی پرانی اور اصلی زبان پشتو میں بات چیت کرتے تھے، چونکہ مرکز حکومت وہی علاقہ رہا، جہاں کی زبان فارسی تھی، اس لئے پشتو کو بھی بہت سے فارسی الفاظ کے اپنانے پر مجبور ہونا پڑا، ہندوستان میں جن بادشاہوں نے حکومت قائم کی وہ بھی فارسی بولنے والے تھے، اور یہاں کا دفتر بھی فارسی ہی میں تھا، اس لئے قدرتی طور پر ان بدیسی حاکموں کے ذریعہ فارسی کا پرچار زیادہ ہوا،

یہ لوگ ہندوستان میں آنے سے صدیوں پہلے اسلام لا چکے تھے اور نسلوں سے عربی زبان ان کی مذہبی مقدس زبان قرار پا گئی تھی، اس لئے ان کے ساتھ عربی الفاظ بھی آئے، کچھ عربی لفظ ان کی فارسی بولی میں دخیل تھے، اور پشتو میں بھی، اس بنا پر عوام وخواص اور مغربی و مشرقی دونوں قسم کے افغانوں کے ذریعے سے اردو میں داخل ہوئے،

ترکی زبان افغانستان کے کچھ علاقے کی زبان بھی تھی، اور بہت سے لفظ ان ترکی قبائل کے توسط سے بھی یہاں کی بول چال میں گھر کر گئے تھے، جو ابتداءً یہاں حکومت کرنے آئے اور رفتہ رفتہ ان میں جذب ہو گئے تھے، غزنوی دور میں ماوراء النہر کے سیکڑوں اہل علم افغانستان کی قدر دانی کی بدولت آبسے تھے، کچھ لفظ یہ بھی تحفۃً لائے ہوں گے،

جب افغانی ہندوستان میں وارد ہوئے تو ان کے ساتھ سب زبانیں بھی آئیں، اور رفتہ رفتہ یہاں کی دیسی زبانوں میں ان کے الفاظ داخل ہو گئے، چونکہ افغانوں نے اپنا ہندوستانی دفتر بھی فارسی ہی میں رکھا تھا، اس لئے قدرتی طور پر فارسی اور وہ عربی لفظ زیادہ اختیار کئے گئے، جو فارسی میں آزادانہ استعمال کئے جاتے تھے، لیکن اس کے ساتھ بہت سے خالص پشتو لفظ بھی داخل ہوئے، ان پشتو الفاظ کی فہرست میں وہ سب لفظ داخل ہیں جو اصلاً سنسکرت سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی مروجہ شکل ہندی میں نہیں پائی جاتی، اور اس لئے یہ کہا جانا چاہیے کہ وہ افغانستان میں ڈھل کر یہاں آئی ہے، اسی طرح وہ پشتو اد

اردو کے مشترک لفظ بھی جن کی سنسکرتی یا پراکرتی اصل نامعلوم یا مشتبہ ہے، اس وقت تک پشتو ہی کے تسلیم کئے جائیں گے جب تک ان کی سنسکرتی یا پراکرتی اصل کا قرار واقعی پتہ نہ چل جائے،

عربی فارسی لفظوں کے پشتو سے آنے کا ثبوت

میرے اس دعوے کا ایک اہم ثبوت یہ ہے کہ ہماری زبان میں بہت سے عربی، فارسی اور ترکی لفظ اپنے اصلی تلفظ سے ہٹ گئے ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ سب تغیرات ہندی لہجہ کا نتیجہ ہوں لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ افغانی بھی ان لفظوں کو بالکل ہمارے مطابق بولتے ہیں تو فوراً یہ سوال دماغ میں پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا ہم نے پہلے ان سکوں کو ڈھالا اور یہاں سے افغانستان بھیجا، یا وہاں سے ڈھلے ڈھلائے ہم تک پہنچے، یا دونوں ملکوں میں بیک وقت ایک ہی قسم کے حالات کے تحت یہ سب تغیرات واقع ہوئے،

جہاں تک امکان عقلی کا تعلق ہے، ان میں سے ہر شق ممکن ہے، لیکن گزشتہ تاریخی پس منظر کے پیش نظر قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے، کہ انھیں افغانی لباس میں ملبوس قرار دیا جائے، اس لئے کہ اسلامی عہد میں ہندوستانی اس تعداد میں افغانستان جاکر آباد نہیں ہوئے کہ ان کی زبان وہاں کے عوام میں بار پا سکتی، نہ خود افغانی یہاں سے ہماری زبان سیکھ کر اس کثرت سے اپنے وطن واپس گئے کہ ان کے واسطے سے یہ تغیر و تبدل افغانستان میں سرایت کرتا رہا، دونوں جگہ ایک ہی قسم کے حالات میں یکساں تغیر ہونا تو اسے مانا جا سکتا تھا، اگر یہ حقیقت پیش نظر نہ ہوتی کہ افغانی ایک ہزار برس سے یہاں کے ایک ایک گوشے میں آجا اور رہ رہے ہیں، اور ہم ان سے سیکڑوں برس تک حاکم اور استاد کی حیثیت سے بہت کچھ سیکھتے رہے ہیں۔

چونکہ یہ بگڑے تلفظ ہمارے عوام کی زبان پر زیادہ تر چڑھے ہوئے ہیں، اس لئے اور بھی یقین ہوتا ہے کہ افغانوں ہی کی وساطت سے ان تک یہ لفظ پہنچے، جو ہمیشہ سے ہندی عوام کے دوش بدوش یہاں اپنی زندگی گزارتے رہے ہیں، یہی باعث ہے کہ جہاں افغانوں کی آبادی زیادہ ہے وہاں ان بگڑے ہوئے لفظوں کا استعمال عوام کیا

خواص میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور پایا جاتا ہے،

مثلاً ہم اردو بولنے والے عوام کو اکثر سنتے ہیں کہ وہ آزردہ کو آزردہ، آسمان کو اسمان، آسمان اور آسمانی کو آسان اور اسانی، آکا کو آکا،[1] اتر کو اوتر، احتیاط کو ہتیاط، اعجوبہ کو جوبہ، اوچی کو الاچی، باغبان کو بغبان، برقع کو برقا، بندوق اور مزاج کو بندوخ اور مزاخ، بزاز کو بجاز یا بجاج، آدمزاد، امرود، بید، بھید اور جلاد کو آدمزات، امروت، بیت، بھیت اور جلات، پتیلہ کو پتیلا، تالاب کو تلاؤ، تراویح کو تراوی، تمباکو کو تماکو، تمغا کو تغما، تندور کو تندر، توبہ کو توبہ، طوطی کو توتا، جرمانہ کو جریمانہ، جمعہ عربی اور جمعہ فارسی کو جمہ یا جما، جانور کو جناور، حبیب کو جیب، حکین کو حلکین، حلم کو حلم، جنجہ کو جنجی، حباب کو حباب، درہم کو درجم، دیوار کو دوال، رفع دفع کو رفا دفا، رکعت کو رکات، رحل کو رحیل، سقایہ کو سقاوہ، صحیح کو سہی، سیر کو سیل، شبہہ کو شبہ، شرکت کو شراکت، ضلع کو ضلع، طمع اور فتح کو ضلا، طلبا اور فتا، صدقہ کو صدقہ، طاق کو طاخ، طمانچہ کو تمانچہ، فراش خانہ کو فراش خانہ، قالب کو قالب، قفل کو قلف، قلعی اور قلعی گر کو قلئی اور قلئی گر، قندیل کو قندیل، کالبد کو کالبوت، کرشمہ کو کرشمہ، گریبان کو گریوان، محبت کو محبت، مشعل کو مشال یا مشل، معصوم کو ماسوم، مرہم کو ملم، نشاستہ کو نشاہ، نیت کو نیت، واسطہ کو واسطہ، وتر کو وتر، ورم کو ورم، ویران کو وران، ہاتھی کو ہاتی بولتے ہیں،[2]

ہماری لغت کی کتابوں میں مذکورہ بالا الفاظ کو عربی فارسی یا ترکی بتایا جاتا

---

[1] پشتو میں آگا بولتے ہیں، تشدید ہندیوں کی کارستانی ہے [2] اس طرح ہمارے یہاں کے عوام و خواص دونوں عربی کے حروف حلقی اور طوے ظوے کو صحیح ادا نہیں کر سکتے مگر اسے میں بھی افغانی اثر نہیں مانتا، کیونکہ جس طرح وہاں کے لوگ ان کا اصلی تلفظ کرنے سے قاصر ہیں، اسی طرح ہمارے گلے بھی اس کے لئے تیار نہیں، یہ تغیر بالیقین ایک قسم کے حالات کا قدرتی نتیجہ ہے،

ہے، اور ان کے بگاڑ کو ہندی اثر کے ماتحت رکھا جاتا ہے، میری نظر میں یہ طریق کار مناسب نہیں، انھیں افغانی بتانا چاہئے، اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دینا چاہئے کہ فلاں زبان کے فلاں لفظ سے پشتو میں بن کر ہماری زبان میں آیا ہے، آپ خود غور فرمائے کہ انگریزی لفظ "لینٹرن" ہمارے یہاں لالٹین ہوگیا ہے، اب اگر کوئی افغانی اسے ہم سے مانگ کر لے جائے اور یہ لفظ وہاں عام ہوکر لغت میں داخل کرلیا جائے، تو کیا پشتو لغت نویس کا یہ لکھ دینا کافی ہوگا کہ یہ انگریزی لینٹرن سے بنا ہے، یقیناً اگر وہ یہ لکھے گا تو علم اللسان کے ماہر اسے غلط کار کہیں گے، ان کا مطالبہ بجا طور پر یہ ہوگا کہ اسے اردو سے مستعار بتایا جائے، ہاں یہ بھی مزید تحقیق کے طور پر لکھ دینا چاہئے کہ اردو میں انگریزی کے فلاں لفظ سے بنا ہے،

سلسلۂ سیر الصحابہؓ

سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد مسلمانوں کے لئے جن مقدس ہستیوں کے کارنامے اور سوانح حیات مشعل راہ ہوسکتے ہیں، وہ حضرات صحابۂ کرام ہیں، جن کے حالات، ضخیم جلدوں میں دار المصنفین نے شائع کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

جلد	کتاب	قیمت	جلد	کتاب	قیمت
جلد اول	خلفائے راشدین طبع سوم	صہ/	جلد ششم	سیر الصحابہ	سے/
جلد دوم	(مہاجرین اول) زیر طبع		جلد ہفتم	سیر الصحابہ	ہے/
جلد سوم	〃 دوم	للعہ/	جلد ہشتم	سیر الصحابیات طبع سوم	
جلد چہارم	سیر الانصار اول (طبع دوم)	ے/	جلد نہم	اسوۂ صحابہ اول	ہے/
جلد پنجم	〃 دوم	ے/	جلد دہم	〃 دوم	للعہ/

"منیجر"

علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر کے

از جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی (علیگ)

اگر ناظرین علامہ کی مدح سرائی کا بھی انداز دیکھنا چاہتے ہوں تو اس کی بھی مثالیں اس کلیات میں موجود ہیں لیکن بہت کم ہیں، اس لئے کہ یہ چیز ان کے مذاق کی نہ تھی، ہمارے نزدیک مداحی شاعری کا کوئی کمال نہیں ہے، خصوصاً وہ مداحی جو عام طور پر ایرانی شعراء نے سلاطین و امراء کی کی ہے اس سے تو کسی بلند خیال اور شریف النفس شاعر کا قلم کبھی آلودہ نہیں ہوسکتا، البتہ اگر ممدوح کی صحیح تعریف کی جائے، اور بیجا مبالغہ اور غلو سے کام نہ لیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں، مثال کے طور پر علامہ کے ایک مدحیہ قصیدہ کے چند اشعار ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں، یہ قصیدہ سابق بیگم صاحبہ بھوپال کی تعریف میں ہے، اور اس موقع پر لکھا گیا ہے، جب بیگم صاحبہ نے ایک متعین ماہانہ رقم سے دار العلوم ندوہ کی امداد فرمائی تھی، اس قصیدے سے در اصل مصنف کو اپنے سپاس مندانہ جذبات کا اظہار مقصود تھا، اور اسی سلسلہ میں کچھ تعریفی اشعار بے اختیار قلم سے نکل گئے ہیں، ملاحظہ ہو،

آنچہ با دشت و چمن ابر بہاراں کردہ است ۔۔۔ خسرو کشور بھوپال بما آں کردہ است

ندوہ را گر سر و سامان رسد از وے چہ عجب ۔۔۔ زانکہ ہر کار کہ او کرد بہ ساماں کردہ است

چوں نگہ کرد کہ دین نبوی در خطر است ۔۔۔ لاجرم یاوری سنت و قرآں کردہ است

رایت علم نگوں بودہ وا فراشتہ است ۔۔۔ چہرۂ شرع حزیں بودہ و خنداں کردہ است

بہر مرداں ہمہ آئین عمل خواہد بود ۔۔۔ آنچہ در تربیت عالم نسواں کردہ است

دانش آموختن پردہ نشیناں عفاف — مشکلے بود کہ از فکر خود آساں کردہ ست

کار آموزش و تعلیم زناں گرچہ خوش ست — نہ بآں شیوہ تواں کرد کہ ناداں کردہ ست

ہر چہ او گفت بآئینِ شریعت گفت ست — ہر چہ او کرد بہ فرمودۂ یزداں کردہ ست

معدلت را بہ سیاست نتواں کرد بہم — دقت او خوش کہ ہم ایں کردہ وہم آں کردہ ست

اس مدح غائبانہ کے بعد بیگم صاحبہ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں،

بے کساں را نگہہ مہر تو بنواختہ است — خستگاں را نظرِ لطف تو درماں کردہ ست

ہر کرا در چمنِ دولت افتاد گذر — صد ہزاراں گلِ امید بداماں کردہ ست

چو رخ از چشم جہاں رابعہ دگر بہ نہفت — باز در پیکر پاکِ تو نمایاں کردہ است

اگرچہ پورا قصیدہ خوشامدانہ مداحی اور بیجا مبالغہ سے بالکل پاک ہے، اور جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں سچائی اور واقعیت ہے، تاہم اتنی مدح بھی علامہ کی طبع غیور پر گراں ہے، چنانچہ آخر میں ضبط نہیں ہوتا، اور صاف کہدیتے ہیں،

شبلی آزردہ ز مدح شہاں شیوہ نبود — لیک لطفت ہمہ را بندۂ احساں کردہ ست

علامہ کو ریاست حیدرآباد سے خاص تعلق تھا، لیکن یہاں بھی عزت نفس اور خودداری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا، ناظرین کو تعجب ہوگا، لیکن ایک اقلیم علم و دانش کے فرمانروا کی شان کجکلاہی کا یہی تقاضہ تھا، غرض علامہ کی شاعری بیجا مدح سرائی کے داغ سے پاک ہے، جو کچھ مدح و تعریف کی ہے وہ کسی خاص موقع یا واقعہ سے متاثر ہوکر کی ہے، اس لئے اس میں عام قصیدہ گویوں کی طرح منافقانہ تصنع کی آلائش نہیں پائی جاتی، بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلوص و محبت کی تحریک سے بے اختیار قلم اٹھ گیا ہے،

علامہ مرحوم نے ایک نعتیہ قصیدہ بھی لکھا ہے، یہ آغاز شباب کے زور قلم کا نتیجہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کو زبان پر کتنی غیر معمولی قدرت حاصل ہے، اور ہم قافیہ الفاظ کا کتنا وسیع ذخیرہ ان کے

پاس موجود ہے، چند آخری نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں،

آں خسرو عرش آستاں آں داورِ گیتی ستاں — آں قبلہ گاہ انس و جاں آں خاتم پیغمبراں

دانائے اسرار نہاں، روح الامینش پاسباں — گردوں برنگِ چاکراں خاکِ درش را بوسہ زن

پیش از ہمہ شاہانش نگر، عیسیٰ ثنا خوانش نگر — چرخ از غلامانش نگر، دوراں قدر ایوانش نگر

برتر ز کیوانش نگر، جبریل دربانش نگر — در بندِ احسانش نگر آبائے علوی ہفت تن

عالم ہمہ خاکِ درش، قیصر فلک عشرت گہش — دیں بارگاہ و نہ تختش، گشتہ کمینہ خرگہش

گیتی و ایں ہفتِ دنش، باشد غبار درگہش — وز جلوۂ نور رخش، روشن شدہ ایں نہ انجمن،

آں تاجدار ملک دیں، دارائے اقلیم یقیں — دانائے علم اولیں، فرماں برش روح الامیں

عالم شدہ ش زیر نگیں، چرخ ش ہمی بوسد زمیں — آدم ہماں در ماء و طیں، او گشتہ میر انجمن

باوجود ایک خاص صنعت کے التزام کے غور کرو، انداز بیان کی روانی اور الفاظ کی فصاحت و موزونی میں کہیں سے کوئی خاص نقص نظر آتا ہے، پورے قصیدہ کا شروع سے آخر تک یہی رنگ ہے،

ناظرین کو علامہ مرحوم کا یہ دعویٰ "زہد را من آشنائی دادہ ام باعاشقی" غالباً یاد ہوگا، مذکورۂ بالا مثالوں میں علامہ نے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے جس والہانہ شیفتگی اور عقیدت کا اظہار کیا ہے، کیا وہ اس دعوی کے ثبوت کیلئے کافی نہیں ہے، یہ وہی دل ہے جس کے رندانہ جوش و مستی کا عالم تغزل کے میدان میں ناظرین دیکھ چکے ہیں، لیکن اب اسی رند مینا بدوش کی اداؤں میں دین و ایمان کے ذوق محبت کی سرشاریاں نظر آرہی ہیں، اور اب اسی زبان سے جو خدا کا نام بھی بے ذوقی سے لے رہی تھی، اتباع کتاب و سنت کی مقدس صدائے دعوت بلند ہو رہی ہے،

ایں سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اصناف سخن میں سے علاوہ قصائد کے مثنوی کی صنف بھی شاعرانہ کمال کا ایک خاص تماشا گاہ

ہے، جہاں شاعری کی قوت نظم کی سحرکاریوں کا اصلی سماں نظر آتا ہے، اگرچہ علامہ نے کسی خاص موضوع پر کوئی مستقل مثنوی نہیں لکھی ہے، تاہم اس کلیات میں کچھ ایسے نمونے موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کی سعی قلم اس میدان میں بھی ناکامیاب نہیں رہ سکتی تھی، مثال کے طور پر ہم علامہ کی ایک خاص نظم کے چند اشعار نقل کرتے ہیں، جس میں ان کے خامۂ سحرکار نے عید اضحیٰ کے موقع پر سلطان ٹرکی کی ادائے نماز کا منظر پیش کیا ہے،

هرچو از جیب افق سر کشید   خاست زہر ناحیہ گلبانگ عید

دیدہ پر از خواب چو برخاستند   پیر و جواں حلہ تن آراستند

شیوۂ و آئین طرب تازہ گشت   کوچہ و بازار پر آوازہ گشت

مژدہ رسید اینکہ شہ چارہ ساز   زود بر آید بادائے نماز

تا برد از خوان کرم توشۂ   خلق بروں ریخت ز ہر گوشۂ

یک نظر راہ تماشا نیافت   نقش قدم ہم بہ زمیں جا نیافت

از دو سوئے راہ بکسب شرف   خلق بآئین ادب بست صف

هرچو در ہر جہت افشاند نور   کوکبۂ شاہ عیاں شد ز دور

گشت رواں از پئے ہم خیل و فوج   موج تو گوئی کہ شکستی بہ موج

بود شعار ہمہ از ہم جدا   ہر ہمہ را رایت و پرچم جدا

پرتو آں اسلحۂ تابناک   نور ہمی ریخت بدامان خاک

باہمہ تمکین چو گذشت ایں گروہ   گشت بیکبار زمین پرشکوہ

غلغلہ برخاست کہ بادا نوید   ہر جہاں تاب خلافت دمید

اس کے بعد سلطان المعظم عبد الحمید خاں کی شان میں کچھ مدحیہ اشعار لکھے ہیں اور آخر میں سلطان

کو مخاطب کر کے اپنے جذبۂ اخلاص و عقیدت کو اس طرح ظاہر کیا ہے،

آں توئی امروز کہ در روزگار   ہست بر و دولت و دیں را قرار

تازگی بدر و حنین از تو ہست   زیب و طراز حرمین از تو ہست

فرۂ دین نبوی از تو ہست   بازوئے اسلام قوی از تو ہست

شہرۂ بجاہ تو چو شد ارجمند   باد بفرمان تو چرخ بلند

سکۂ اقبال بنام تو باد
هرچہ بگیتی ست بکام تو باد

قسطنطنیہ سے عزیزان وطن کو مخاطب کر کے ایک ناتمام مثنوی کی صورت میں اپنے حالات و کیفیات کو بیان کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں،

از کرم داور بالا و پست   حال من آنگونہ کہ بایست ہست

ہم بہماں طرز و روش میزیم   زندہ ام و فارغ و خوش می زیم

نیست سر انجمن آرائی   ایں منم و گوشۂ تنہائی

دیدنکہ بہر سید کہ زاں جلوہ گاہ   تا چہ بود حاصل چشم و نگاہ

ہے چہ تواں گفت کہ ذوق سخن   ہر نفسم می برد از خویشتن

گرچہ بخواہم کہ نشینم خموش   فرصت آں کو کہ بیایم بہوش

گرچہ بعرض سخن آمادہ ام   مست ز کیفیت ایں بادہ ام

بگذر ازیں حرف و مکرر مپرس   خواب خوشی دیدم و دیگر مپرس

تندئے بود خرابم ہنوز   دیدۂ من باز و بخوابم ہنوز

باتو چگویم کہ چہا دیدہ ام   شعبدہ ہا پیش نظر چیدہ ام

بزم جو از جلوۂ زیبا پر است

دامن چشم ز تماشا پر است

علاوہ واقعہ طرازی اور تسلسل خیال کے مذکورۂ بالا مثالوں کی لطافت زبان پر غور کرو، معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاف، شیریں قدرتی چشمہ پہاڑ کے دامن پر نکل کر بلا کسی رکاوٹ کے مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے،

ابتک جو کچھ لکھا گیا، اس سے ناظرین کو علامہ کی پرجوش اور ولولہ انگیز طبیعت کی سرمستیوں اور رعنائیوں کا کافی طور پر اندازہ ہو گیا ہوگا، اب دیکھنا یہ ہے کہ علامہ نے درد و غم کے جذبات کس طرح ادا کئے ہیں کہ یہ بھی شاعری کا ایک خاص میدان ہے،

اس کلیات میں متعدد مراثی ہیں، اور یہ ان بزرگوں کی وفات پر لکھے گئے ہیں، جن کی علامہ کے دل میں خاص وقعت اور محبت تھی، لیکن باوجود اس کے ان مرثیوں میں درد و غم اور سوز و گداز کی وہ خاص کیفیت محسوس نہیں ہوتی جو اصولاً مرثیہ کیلئے نہایت ضروری ہے، مثلاً نواب ضیاء الدین خاں متخلص بہ نیر کا مرثیہ لکھتے ہیں، تو اس کی ابتدا یوں کرتے ہیں،

گرم ہنگامہ شو اے نالۂ دل ہاں برخیز | از پئے برہمی عالم امکاں برخیز

تو ہم اے آہ جہاں سوز بساماں برخیز | اے جنوں باز بتاراج گریباں برخیز

چشم خونابہ فشاں خواست چو طوفاں کردن

خوں شو اے دل کہ تو انم سر و ساماں کردن

غور کرو، یہ کسی غمزدہ دل کی ندائے درد ہے، یا کسی بلند حوصلہ جوان کا نعرۂ جنگ ہے!

دوسرے بند کا انداز ملاحظہ ہو فرماتے ہیں،

دو جہاں این ہمہ درہم شدہ چون ست بگو | آسماں حلقۂ ماتم شدہ چون ست وچہ ست

ہر داغ دل عالم شدہ چون ست وچہ ست | اختراں دیدۂ پرنم شدہ چون ست وچہ ست

شاہد روز بمرگ کہ بماتم بنشست

از چہ لیلائے شب آشفتہ و درہم بنشست

یہاں بھی انداز بیان کے جوش و خروش کا وہی عالم ہے، حالانکہ یہ جوش و خروش کا وقت نہیں ہے، اور نہ قلم سے شاہد روز و لیلائے شب وغیرہ کی سی رنگین ترکیبوں کے نکلنے کا موقع ہے، غور کرو، یہ صرف ایک باکمال اور نکتہ سنج شاعر کی وفات کا واقعہ ہے، اس کا اثر صرف بزم سخن کو ملول اور افسردہ کر سکتا تھا، لیکن دیکھو، زور قلم نے اس اثر کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا، یعنی تمام کائنات ارضی و سماوی پر گویا غبار غم کی تاریکی چھا گئی، حالانکہ یہ حادثہ ایسا نہ تھا کہ نظام کونین درہم برہم ہو جاتا، آسمان حلقۂ ماتم بن جاتا، ستارے اشکباری کرنے لگتے، اس سے میری یہ مراد نہیں ہے کہ علامہ کا دل اس واقعہ سے متاثر نہ تھا یا انھوں نے محض تصنع سے کام لیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ علامہ اپنے ولولہ انگیز دل و دماغ اور سحر کار قلم کی رعنائیوں سے مجبور تھے، اس لئے جذبات غم کی مصوری ان کے بس کی چیز نہ تھی، قدرت نے ان کو ایک رنگین اور شگفتہ طبیعت عطا کی تھی جس کیلئے نوحہ خوانی نہایت دشوار کام تھا، چنانچہ اپنے والد مرحوم کے مرثیہ میں صاف طور پر اپنی اس مجبوری کی معذرت کر دی ہے،

دستاں سرائے بزم طرب بودہ ام بدہر | بارے بنوحہ زمزمہ سنج فغاں مکن

علامہ نے اس شعر میں اپنی فطرت کا اصلی مذاق ظاہر کر دیا ہے، اب اس کے بعد انکے زبان و قلم سے کیا شکایت کی جا سکتی ہے،

خونی تعلق کے جوش و اثر کی بناء پر خیال تھا کہ والد کے مرثیہ میں کم از کم انداز بیان کچھ ایسا پرسوز اور دردانگیز ہوگا کہ پڑھنے والے کی بھی آنکھیں پرنم ہو جائینگی، لیکن اس موقع پر بھی دل میں درد و غم کی جو روح [illegible]

تڑپ تھی اسکی کوئی موثر تصویر آنکھوں کے سامنے آنہ سکی، البتہ علامہ نے اپنے محترم استاد مولانا فیض الحسن مرحوم سہارنپوری کا جو مرثیہ لکھا ہے اس کے انداز بیان میں کچھ سوز وگداز کی کیفیت ضرور محسوس ہوتی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں،

دریں آشوب غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم جہانے را جگر خوں شد ہمیں تنہا نہ من گریم

بہ تحسین صبوری چند بفریبی مرا ناصح دمے بگذار تا در ماتم فیض الحسن گریم

بہ رگش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد ہنر بر خویشتن گرید چو من بے خویشتن گریم

خود ایں آشوب ایں ہنگامہ از یادم نخواہد شد ہماں نو باشد ایں غم تا دریں دیر کہن گریم

بیکبار انجمن برہم زدی تا از میاں رفتی سزد من گر دریں ماتم چو شمع انجمن گریم

چہ دردل تا از کہ رنجیدی چرا رفتی
زما بگسستہ اے مولاے ما آخر کجا رفتی

علمی و ادبی فضائل وکمال کے لحاظ سے مولانا فیض الحسن مرحوم کی ہستی عدیم المثال تھی، علامہ مرحوم نے انکے مکتب درس سے خاص طور پر کسب فیض کیا تھا، اس لئے ان کی وفات سے علامہ مرحوم کو غیر معمولی صدمہ پہنچا تھا جس کا اندازہ آخری بند کے چند اشعار سے ہو سکتا ہے،

ز بس درد کار غم دل بودہ است و دیدۂ تر ہم بخاک تربت او لعل افشاندیم و گوہر ہم

سخن را ایں چنیں شیرازہ بستن تا کہ تواند پس از وے دفتر معنی پریشاں گشت و ابتر ہم

صبا گر بگذری بر تربت پاکش بگو از من کہ اے در شیوۂ دانش مرا استاد و رہبر ہم

درود دے تحفۂ پیش آوردہ ام باشد کہ بپذیری کہ شبلی خاکبوس در گہت بود است و چاکر ہم

ازیں خواب گراں آخر چو روز حشر برخیزی
چو صور حشر من در نالہ ام وقت است اگر خیزی

لیکن اس انتہائی غم کی حالت میں بھی طبیعت کی شوخی و رعنائی نہیں گئی چنانچہ دوسرے بند میں مولانا مرحوم کے فضل و کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ شعر بھی قلم سے نکل گیا،

نکیرین از و گر اسجد لطف طبع رنگینت سنا فہماں ندانم چوں پسندی ہمزباں بودن

غرض واقعہ یہ ہے کہ علامہ کا ادبیانہ قلم کسی موقع پر رنگینی سے باز نہیں آسکتا تھا، یہ انکی فطرت تھی اور فطرت کا بدلنا نہایت دشوار بلکہ تقریباً ناممکن ہے

لکھنے کو تو اب تک بہت کچھ لکھ گیا، لیکن معلوم نہیں کہ ارباب نظر کے نزدیک میری یہ ناچیز سعی کس حد تک علامہ مرحوم کے کلام پر نقد و تبصرہ کرنے میں کامیاب ہوئی ہے، لیکن اتنی توقع ضرور ہے کہ باوجود ذاتی محدود قابلیت کے جو کچھ عرض کر سکا ہوں اس سے اہل ذوق کو علامہ مرحوم کی شاعری کے نمایاں محاسن و خصوصیات کا کافی طور پر اندازہ ہو گیا ہوگا،

علامہ کے خیالات و جذبات کی شوخی، رعنائی، حرارت، بلندی اور لطافت کچھ کم قابل قدر نہیں ہے، لیکن ہمارے نزدیک بحیثیت فارسی شاعر کے انکا اصلی کمال ان کی خالص ایرانی طرز ادا ہے جو بہت کم ہندی نژاد فارسی شعرا کے کلام میں نظر آتی ہے، علامہ نے تقریباً ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے، لیکن ہر جگہ زبان کے لحاظ سے اپنے صحیح ذوق فارسیت کا ثبوت دیا ہے یعنی ہندوستان میں رہکر انھوں نے وہ زبان استعمال کی ہے جس پر اہل زبان کو بھی حرف گیری کی جرأت نہیں ہو سکتی، علامہ اگرچہ الفاظ و محاورات کی صحت کا خاص خیال رکھتے تھے یعنی کوئی لفظ یا محاورہ ان کے قلم سے ایسا نہیں نکلتا تھا جس سے ہندوستانیت کی بو آتی ہو، تاہم سفر روم کے قصیدے میں ایک جگہ لفظ "عرصہ" بمعنی مدت و زمانہ استعمال کر گئے ہیں، حالانکہ فارسی میں یہ بمعنی میدان وغیرہ مستعمل ہے، مثلاً عرصۂ عالم، عرصۂ محشر عرصۂ خیال وغیرہ، مدت و زمانہ کے مفہوم میں اس کا استعمال صحیح نہیں ہے وہ شعر یہ ہے،

آں ندیم آنکہ رفیق است و ہم استاد مرا ہم دراں عرصہ باتگاپنہ ز ہمی خواست سفر

لیکن ہمارے نزدیک یہ قلم کی محض اتفاقی لغزش معلوم ہوتی ہے ورنہ یہ کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ علامہ کو اس کا صحیح فارسی لفظ معلوم نہیں تھا، خیالات کی رو میں نادانستہ اس قسم کا سہو اساتذۂ فن سے بھی ہو جاتا ہے،

غرض علامہ مرحوم نے باوجود اپنی علمی مصروفیتوں کے فارسی شاعری کا جو نمونہ پیش کیا ہے اس کی ندرت اور بلند پایگی سے انکار نہیں ہو سکتا اور نہ مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے دوسرے فارسی گو شعرا کے کلام میں اس کی مثال مل سکتی ہے،

اکثر باکمال شعرا نے اپنے کمال فن پر اظہار فخر کیا ہے، فیضی، عرفی وغیرہ کے فخریہ اشعار تمھاری نظر سے گذرے ہوں گے، علامہ نے بھی متعدد مواقع پر اپنے اس احساس کا اظہار کیا ہے، زبان کی لطافت روانی اور برجستگی کے لحاظ سے بھی یہ اشعار سننے کے قابل ہیں، سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں فرماتے ہیں،

باز برآنم کہ دریں داوری دل برم از خلق با فسونگری
خواستہ ام طرح دگر ریختن شعبدۂ تازہ برانگیختن
بزم دگر ہست و تماشا دگر بادہ دگر آرم و مینا دگر
زمزمۂ تازہ بساز افگنم غلغلہ در حلقۂ راز افگنم
بادہ فرستم بحریفان دگر از مے دوشین قدرے تندتر
زخمہ کہ بر تار سخن می زنم ہاں بنگر تا بچہ فن می زنم
قاعدۂ سحر طراز یست ایں نیک نگہ کن کہ چہ بازیست ایں
حرمت ایں کار نگہداشتن نامہ بہ لعل و گہر انباشتن
کار من ست ایں حد ہر خام نیست ایں بود آں مے کہ بہ ہر جام نیست
کان معانی ہمہ کاویدہ ام کیں گہرے چند فراچیدہ ام
غارت بتخانۂ چیں کردہ ام تا صنمے چند گزیں کردہ ام

خاک در میکدہ ہا بیختم کیں مے صافی بقدح ریختم
گرچہ متاع از دگر آوردہ ام قطرہ ربودم گہر آوردہ ام

گرچہ ہرا شیوۂ فن ایں نبود حرف بہ اردو زدن آئیں نبود
پیشتر ار گرم طلب بودہ ام بادیہ پیمائے عرب بودہ ام
بزم چو آں فرۂ و آں ساز داشت ساغر من بادۂ شیراز داشت
لیک چو آں مطرب و ساقی نماند بوے ازاں میکدہ باقی نماند

ایک دوسری نظم کے سلسلہ میں علامہ کی جدت آفریں طبیعت کی شان ملاحظہ ہو،

خواہم اکنوں عناں بگردانم رسم پیشینیاں بگردانم
زیں بساط کہن چو برخیزم پیکرے تازۂ برانگیزم
رسم دیرینہ را براندازم در سخن طرح دیگر اندازم
بدہم خلق را فسون دگر کردہ ام ساز ارغنون دگر
تا بسنجی کہ باکمال سخن تنگی نیست در مجال سخن

بطور دیباچۂ الفاروق علامہ مرحوم نے جو قطعہ لکھا ہے، اس کو اس موقع پر نظر انداز کر دینا ارباب ذوق پر بہت بڑا ظلم ہوگا اور اب ہم اسی قطعہ پر اس ریویو کو ختم کرنا چاہتے ہیں عجیب پر جوش اور کیف انگیز قطعہ ہے، فرماتے ہیں،

منکہ یکچند زدم مہر خموشی بر لب کس چہ داند کہ دریں پردہ چہ سودا کردم
پیکر تازہ کہ خواہم بہ عزیزاں بنمود لختے از ذوق خودش نیز تماشا کردم
محفل از بادۂ دوشینہ پر از سود ہنوز بادۂ تندتر از دوش بہ مینا کردم
باز خواہم کہ دمم در تن اندیشہ رواں منکہ دریوزۂ فیض از دم عیسیٰ کردم

ہمنشیں نکتۂ حکمت ز تو بیعت می جست — نفحے از نسخۂ روح القدس املا کردم

شاہد راز کہ کس پردہ ز رویش نگرفت — گرہ از بند قبایش بہ فسوں وا کردم

بسکہ ہر بار گہر پاش گذشتم زیں راہ — دشت معنی ہمہ پر لولوے لالا کردم

افسوس کہ اس خامہ سحر کار کی گہرپاشیوں سے چمنستان ادب ہمیشہ کیلئے محروم ہوگیا، معلوم نہیں کہ علامہ کے ان لطیف نازک اور پرکیف نغموں نے اہل ذوق کے شاعرانہ احساس پر کیا اثر ڈالا ہے، لیکن ہم تو علامہ مرحوم کی بارگاہ سے یہ کہکر رخصت ہوتے ہیں،

"بانگ فلتِ دریں شب تار — بس معنیٔ خفتہ کرد بیدار"

کلیاتِ فارسی

مولانا شبلی مرحوم کے تمام فارسی قصائد، غزلیات، مثنویات، اور قطعات کا مجموعہ جو اب تک متفرق طور سے دیوان شبلی، دستہ گل، بوئے گل، برگ گل کے ناموں سے چھپے تھے، اس میں سب یکجا کردیئے گئے ہیں، قیمت عہ ۸/

کلیاتِ اردو

مولانا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ، جس میں مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی، اور تاریخی نظمیں جو کانپور، ترکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہیں، یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں کی پچاس سالہ جدوجہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، قیمت عار

ہندوستان کے کتب خانے

از مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

(۴)

جونپور کے کتبخانے

خاندان تغلق کے زوال کے زمانہ میں جب ہندوستان کا ہر صوبہ دار خود مختار ہوگیا تو جونپور کے نائب حکومت خواجہ جہاں نے بھی ملک الشرق کا لقب اختیار کرکے شرقی خاندان کی بنیاد رکھی، اس کے جانشینوں نے قنوج سے لیکر بنگال تک کا خراج وصول کیا

یہ بڑا زرخیز خطہ تھا اس لئے بہت جلد یہاں کے حکمراں طاقتور ہوگئے اور بہت جلد ترقی کرکے تمدن کے تمام لوازم جونپور میں جمع کردئے، بڑی بڑی مسجدیں، خانقاہیں، سرائیں، مدرسے، حمام اور عالیشان محلات تعمیر کرائے،

گو اس سلطنت کی عمر بہت تھوڑی یعنی صرف اسی برس رہی، مگر شاہان شرق کی قدردانی اور جوہر شناسی سے ہر قسم کے اہل کمال جونپور میں جمع ہوگئے تھے، علما، کی قدردانی کا یہ حال تھا کہ خود بادشاہ وقت ان سے ملنے جایا کرتے تھے، مدارس اور خانقاہوں کیلئے لاکھوں روپیے کی جائدادیں وقف کیں اور علماء کیلئے بڑے بڑے وظائف مقرر کئے،

سلطنت کے انقلاب کے بعد جب مغلوں کا دور آیا تو ان کی قدرافزائی کی وجہ سے پرانی سرگرمی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا، شاہجہاں فخریہ طور پر کہا کرتا تھا کہ "شرق ماشیراز ماست" برہان الملک جب اودھ کا صوبہ دار ہوکر آیا تو اس نے اصحاب کمال کی تمام جاگیریں چھین لیں اور وہ لوگ پریشان حال ہوکر منتشر ہوگئے، اور یہ علمی بزم درہم برہم ہوگئی،

سلاطین شرق نے اپنے عہد میں بے شمار مدرسے قائم کئے، اور یہ سلسلہ عہد مغلیہ تک قائم رہا، تاریخوں سے مندرجہ ذیل مدارس کا خاص طور پر پتہ چلتا ہے،

(۱) مدرسہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی (۲) مدرسہ عادل (۳) مدرسہ استاذ الملک (۴) مدرسہ ملا محمود (۵) مدرسہ شیخ رکن الدین (۶) مدرسہ ملا خضری (۷) مدرسہ حمادیہ (۸) مدرسہ ملا شمس نور (۹) مدرسہ صادقیہ (۱۰) مدرسہ خلیلیہ (۱۱) مدرسہ جمیلیہ (۱۲) مدرسہ ملا باب اللہ (۱۳) مدرسہ صدر جہاں (۱۴) مدرسہ شمس الدین

یہ وہ مدارس ہیں جن کا درجہ آجکل کے کالجوں کے برابر تھا، ان میں بڑے بڑے مشہور ماہر فن تعلیم دیتے، ان مدارس کی اپنی عمارت ہوتی تھی، طلبہ کیلئے دار الاقامے اور ان کے ساتھ مسجدیں اور کتبخانے تھے، غرض تعلیم کی تمام ضروریات ان میں مہیا تھیں،

ان کے علاوہ بے شمار ذاتی کتبخانے بھی تھے، مولوی مشتوق علی مرحوم ۱۲۶۲ھ کا کتبخانہ جونپور میں خاص شہرت رکھتا تھا، اس کتبخانہ میں پانچ ہزار کتابیں تھیں، وہ خود درس و تدریس کا ذوق رکھتے تھے، اور ان کے درس میں ہر فن کے طلبہ رہتے، اس سے قیاس ہوتا ہو کہ اس کتب خانہ میں ہر قسم کی کتابیں رہی ہوں گی، آپنے ایک کتاب تحفۂ لطیفہ کے نام سے اخلاق میں اور دوسری فرائض میں تالیف کی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو اخلاق اور فقہ سے خاص دلچسپی تھی،

ایک اور کتبخانہ مفتی سید ابو البقا متوفی ۱۱۰۱ھ کا تھا، وہ شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں جونپور کے مفتی تھے، آپ کی ذہانت اور حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ کتاب پڑھ لینے کے بعد زبانی یاد ہو جاتی تھی، ایک مرتبہ شاہجہاں نے ایک ایسی کتاب اصلاح کیلئے بھیجی جو متعدد جگہ سے خراب ہو گئی تھی، انھوں نے اس کو ایک مرتبہ پڑھ کر کتب خانہ میں رکھدیا، اور بھول گئے، چھ مہینے کے بعد جب بادشاہ کی طرف سے تقاضا شروع ہوا تو آپ کو خیال آیا، اتفاق سے کتب خانہ میں ہر چند تلاش کیا مگر نہ ملی، بالآخر خود اپنے قلم سے مکمل کتاب لکھکر بادشاہ کے پاس بھیجدی، بادشاہ بہت خوش ہوا اور انعام و جاگیر سے سرفراز فرمایا،[۵]

عادل شاہی کتبخانے

سلطنت بہمنی کے خاتمہ کے بعد دکن میں پانچ نئی سلطنتیں قائم ہوئیں، بریدشاہی، قطب شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی اور عادل شاہی، ان میں سے عادل شاہی سلطنت سب سے زیادہ طاقتور تھی، اس کے تعلقات ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک سے بھی بہت دوستانہ تھے، ایران اور روم کے سفیر ایک دوسرے کے یہاں اکثر آتے رہتے تھے، اور نادر تحائف کے ذریعہ محبت کے رشتہ کو مضبوط کرتے تھے،

عادل شاہی سلاطین جس طرح سیاسی معاملات میں بہت ذی ہوش تھے اسیطرح علوم و فنون کی سرپرستی میں بھی ممتاز تھے، ان کا دربار شعراء، فضلاء، حکماء سے بھرا رہتا تھا، ملا ظہوری، ملا ملک قمی، ملا فتح اللہ شیرازی، خواجہ عنایت اللہ شیرازی، قاسم فرشتہ سب اسی دربار سے متعلق تھے،

اس قدردانی کے سبب فارس، عراق، آذربیجان اور عرب سے اہل کمال کھنچ کھنچ کر یہاں آگئے تھے، رفیع الدین شیرازی جو خان سالار اور خزانچی تھا اس کا بیان ہے کہ شیراز میرا وطن ہے اس لئے میں صحیح طور پر جانتا ہوں کہ دس ہزار اشخاص بادشاہ کی قدردانی سے فیضیاب ہوئے،

تصنیف، تالیف و ترجمہ کا جس قدر کام اس سلطنت کے زیر سایہ ہوا، اتنا اس کی حریف سلطنتوں میں سے کسی نے انجام نہیں دیا، اس عہد میں بکثرت مساجد، مدارس، سرائیں، پل اور خانقاہیں بنوائی گئیں، کتابوں کا بھی اس خاندان کو خاص ذوق تھا، اور ایک بڑا شاہی کتبخانہ بیجاپور میں قائم تھا، خود علی عادل شاہ متوفی ۹۸۸ھ کتابوں کا بڑا دلدادہ تھا، اکثر اس کے مطالعہ میں کتابیں رہتی تھیں، شاہی کتبخانہ کے علاوہ اس کا ذاتی کتب خانہ بھی تھا جو سفر و حضر میں ہمیشہ اسکے ساتھ رہتا تھا، تاریخوں میں عادل شاہ کی نسبت لکھا ہے کہ

کتابوں کی طرف اس کو بڑی رغبت تھی، ہر قسم کی کتابیں مہیا کر کے کتب خانہ میں داخل کی تھیں، اس کتب خانہ میں ساٹھ آدمی کام کرتے تھے جس میں کاتب، خوشنویس، مذہب (طلاکار)

---

[۱] ماثر بسا تین السلاطین ص ۱۴۴،

جدول بنانے والے، جلد ساز، نقاش ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہتے،

چار صندوق منتخب کتابیں ہمیشہ اس کے ساتھ سفر و حضر میں رہتی تھیں، ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ سفر کا آخری دن تھا، بارش بہت سخت ہوئی لشکر منتشر ہوگیا، بادشاہ بھی ایک جگہ خیمہ زن ہوا، اور مطالعہ کیلئے کتابیں مانگیں، معلوم ہوا کہ اس پریشانی میں کتابیں کسی دوسرے گاؤں میں لشکر کے ساتھ چلی گئی ہیں، علی عادل شاہ بہت برہم ہوا، اور کہا بارہا میں نے تاکید کی کہ کتابیں ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہا کریں، لیکن تم لوگ خیال نہیں کرتے، اور اسی وقت ایک امیر خاص کتابیں لانے کیلئے مقرر متعین کیا گیا اور جب تک کتابیں نہ آگئیں وہ بے قرار رہا،[1]

کتب خانوں کا انتظام | موجودہ زمانہ کی طرح قدیم زمانہ میں بھی کتب خانہ کے انتظام کیلئے ایک خاص محکمہ ہوتا تھا، جس کے ماتحت بہت سے چھوٹے بڑے عہدہ دار ہوتے، خانقاہ، مدارس، مساجد اور ذاتی کتب خانوں کو چھوڑ کر جو کتب خانے سلاطین یا امرائے ملک قائم کرتے اس کے لیے ایک خاص عمارت علیحدہ بنواتے، اس میں ہوا اور روشنی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور اس کا لحاظ بھی رکھا جاتا تھا کہ زمین ایسی ہو جہاں دیمک یا اس قسم کے دوسرے کیڑے نہ پیدا ہوں، فرش ایسا ہو کہ جس پر نمی کا اثر نہ ہو سکے کہ اس سے کتابیں جلد خراب ہو جاتی ہیں، جیسا کہ ہمایوں اور اکبر کے کتب خانوں کی عمارت سے ظاہر ہوتا ہے،

ناظم | کتب خانہ کا سب سے بڑا عہدہ دار ناظم ہوتا تھا، جس کو معتمد بھی کہتے تھے،[2] اس کو آمد و خرچ تقرری اور برطرفی ہر قسم کے اختیارات حاصل ہوتے تھے، شاہی کتب خانہ کا یہ عہدہ عموماً اراکین دولت کیلئے مخصوص تھا، جیسا کہ عموماً شاہی کتابوں کے مہروں سے معلوم ہوتا ہے،

داروغہ یا مہتمم | اس کے بعد دوسرا درجہ مہتمم کتب خانہ کا تھا جو ناظم کے زیر ہدایت کتب خانہ کا انتظام کرتا تھا، اس کیلئے اعلیٰ قابلیت اور علوم و فنون میں کافی دستگاہ ضروری تھی، اس کا

---

[1] بساتین السلاطین ص ۲۴۸ [2] شاہجہان نامہ ج ۲ ص ۵۰۵ و معارف جلد ۱۸ ص ۲۲۳، ۲۲۴

ایک نائب بھی ہوتا، انتظامی امور کے علاوہ کتابوں کا انتخاب، ان کی خریداری، اور فنون کے اعتبار سے ان کی تقسیم، اس کا کام ہوتا تھا، اس کے زیر نگرانی متعدد منشی (کلرک) ہوتے تھے، جن کا کام رجسٹروں میں کتابوں کا اندراج، ہر فن کا رجسٹر الگ الگ رکھنا، کتابوں پر نمبر لگانا وغیرہ ہوتا[1]، جیسا کہ شاہان اودھ کے کتب خانہ میں دستور تھا،

صحاف و وراق | ان کے ماتحت متعدد ملازم ہوتے جو کتابوں کو صندوقوں یا الماریوں میں ترتیب کے ساتھ رکھتے اور نکالتے تھے، انہیں کے زیر نظر صحاف اور وراق بھی ہوتے،[2] جو ایک ایک کتاب کو نکالکر جھاڑتے اور ایک ایک ورق کھولکر صاف کرتے جو اوراق چپک جاتے ان کو علیحدہ کرکے گرد و غبار سے پاک و صاف کرتے،

جلد ساز | کتب خانہ کیلئے جلد سازوں کا ہونا بھی ضروری تھا جن کی تعداد ضرورت کے مطابق کم و بیش ہوتی رہتی، یہ جلد ساز اپنے فن کے ماہر اور جس زمانہ میں جس قسم کی جلدوں کا رواج ہوتا اس سے بخوبی واقف ہوتے[3] اور بحمد اللہ کہ آج بھی حیدرآباد دکن میں ویسے جلد ساز موجود ہیں جو سلف کے یادگار اور ان کے صحیح جانشین ہیں

مصور | ہر کتب خانہ میں متعدد مصور ہوتے تھے، جو کتابوں میں بہترین قسم کی تصویریں بناتے تھے ان کو مصوری میں اتنا کمال حاصل ہوتا تھا کہ ان کی تصویروں میں صرف مصور حقیقی کے روح ڈالنے کی کسر رہ جاتی تھی، اور یہی حال نقاشوں کا تھا جن کی رنگ برنگ کی نقاشی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھولوں کا چمن کھلا ہوا ہے، یہ رنگ سازی اور رنگ آمیزی دونوں کے ماہر ہوتے تھے، رنگ کی پختگی کا یہ حال تھا کہ آج سے دو دو سو اور تین تین سو برس پہلے کی بنائی ہوئی تصویروں اور نقش و نگار کے رنگوں کی شوخی آب و تاب اور چمک دمک میں کوئی فرق نظر نہیں آیا اور معلوم ہوتا ہے کہ مصور یا نقاش بھی اپنا کام ختم کرکے گئے ہیں

---

[1] فہرست کتب خانہ رامپور جلد اول ص، [2] ماثر رحیمی جلد ۳ صفحہ ۱۶۲۵ [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۱۶۸۱

خوشنویس | متعدد خوشنویس (یا خطاط) کا ہونا بھی ضروری تھا جو خط کوفی نسخ نستعلیق اور شکست وغیرہ مختلف قسم کے خطوط کے ماہر ہوتے تھے، ان سے یا تو مکمل کتاب لکھائی جاتی یا ان کتابوں کی تکمیل کرائی جاتی جو کسی صورت سے ناقص رہ گئی ہوں[۱]،

کاتب | متعدد کاتب ہوتے تھے جو نایاب کتابوں کی نقل کرتے رہتے[۲] انھیں کیساتھ نقل نویس بھی کام کرتے جو ضرورت کے وقت کتابوں کے خاص خاص حصوں کو جلدی سے نقل کر دیتے،

مقابلہ نویس | ان دونوں کی لکھی ہوئی کتابیں مقابلہ نویس کے پاس جاتیں، انکا کام اصل کتاب سے منقول شے کا مقابلہ اور اغلاط کی تصحیح تھی[۳]،

مصحح | اسکے علاوہ کتب خانہ میں لائق اور ذی علم مصحح بھی ہوتے تھے جنکا کام کرم خوردہ یا مٹے ہوئے الفاظ کی جگہ صحیح لفظ لکھنا اور خاص خاص قسم کی دوسری غلطیوں کی اصلاح تھا،

جدول ساز | جدول ساز کا بھی ایک عہدہ ہوتا تھا، جو سادہ، رنگین، سنہری روپہلی ہر طرح کا ہر قسم کی جدولیں بناتے تھے[۴]۔

فراش | ادنیٰ درجہ کے ملازموں میں ایک فراش ہوتا جسکا کام کتب خانہ کی صفائی تھی وہ کتبخانہ کے اوقات سے پہلے آکر فرش کو جھاڑ کر صاف کر دیتا

کتبخانہ کے متعلق اعلیٰ حکام سے اکثر خط وکتابت بھی ہوتی رہتی تھی اور مالی معاملات یا اختلاف رائے کے سبب سے مکاتبات کی تعداد زیادہ ہو جاتی تھی اس لئے خطوط اور کتابیں کتبخانہ سے باہر لیجانے اور لانے کیلئے علحدہ ایک خادم ہوتا تھا، اس خادم کے ہم پلہ چند اور ملازم بھی ہوتے تھے جنکو دربان یا محافظ کہتے تھے، جو باری باری کو شب و روز کتبخانہ کی عمارت کی حفاظت کرتے تھے اور آنے جانیوالوں کو بھی نگاہ میں رکھتے تھے،

تنخواہوں کے اعتبار سے ناظم کے علاوہ سب سے بڑی تنخواہ مہتمم کی ہوتی تھی، پھر نائب مہتمم کی اسکے بعد مصوروں، نقاشوں، جدول سازوں، خوشنویسوں، کی تنخواہیں زیادہ ہوتی تھیں، کاتب، منشی، مقابلہ نویس اور مصحح کی تنخواہیں ان سے کم اور نقل نویس کی ان سے کمتر، مصحف اور رداق کی اور بھی کم اور خادم، فراش اور دربانوں کی تنخواہیں عام طور سے بہت معمولی ہوتی تھیں[۵]،

---

[۱] ماثر رحیمی ج ۳ ص ۱۶۷۱، کلکتہ [۲] ایضاً ص ۱۶۸۳ و ۱۶۸ [۳] فہرست کتبخانہ رامپور ج ۱ص ۱، [۴] ماثر رحیمی [۵] ایضاً فقرات ۲، [۶] فہرست کتبخانہ رامپور جلد اول ص ۷،

مطبوعات جدیدہ

اسلامی تعلیمات - از جناب مولوی میر ولایت علی صاحب، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۴۰ صفحے کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد للعہ، پتے: میر ولایت علی اعظم پورہ شرقی نمبر مدرسہ اعزہ مکان نمبر ۳۲۱ حیدرآباد دکن و نفیس اکیڈمی ذیلدار روڈ اچھرہ لاہور، و بلاسس روڈ کراچی نمبرا

یہ کتاب مصنف کے مذہبی واصلاحی مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں حسب ذیل مضامین ہیں: مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا، محکمات و متشابہات کی حقیقت، حقیقت جہاد، نعرہ اتحاد، تفسیر سورۂ والعصر، انسان اور اس کا تنزل، تلاوت قرآن پاک، توبہ کی حقیقت، صلائے عمل، نعرہ اتحاد، تاثرات حج جنت کی کنجی، خلافت و بادشاہت، تفسیر سورہ فاتحہ، تقدیر الٰہی و تدبیر انسانی، حقائق معراج، ان مضامین کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف ایک دردمند مسلمان ہیں، ان کا دل مسلمانوں کی بے عملی، مذہب سے بیگانگی اور ان کے دنیاوی تنزل وادبار پر دکھتا ہے، اس کی اصلاح کے لیے انھوں نے یہ مضامین لکھے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف اوقات میں مختلف تحریکوں اور اثرات سے متاثر ہوتے رہے جن کے ماتحت ان کے خیالات بدلتے رہے، کبھی ان میں مسلمانوں کی صحیح مذہبی اصلاح اور ان کی وحدت و تنظیم کا جذبہ پیدا ہوا، کبھی وحدت انسانی اور وحدت ادیان کا، کبھی عنایت اللہ مشرقی کے خیالات اور تحریک خاکسار سے متاثر ہوئے، اس لیے ان کے خیالات میں وحدت و یکسانی کے بجائے ایک طرح کا انتشار بلکہ تضاد پایا جاتا ہے، اس لیے اس مجموعہ کے خالص مذہبی مضامین تو مفید ہیں لیکن بعض خیالات اور ان سے متعلق آیات و احادیث کی تاویلات بحث و نظر کے قابل ہیں جن کی تفصیل کا اس ریویو

مین گنجائش نہین، مصنف کے حسن نیت مین شبہہ نہین لیکن اگر وہ مخمل مین ٹاٹ کا پیوند نہ لگاتے تو یہ مجموعہ زیادہ مفید ہوتا، تاہم اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہین ہے،

نظامی بدایونی۔ مرتبہ جناب محمد احمد صاحب کاظمی، ایڈوکیٹ الہ آباد، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۷۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ؎، پتہ:۔ محمد احید الدین احمد صاحب نظامی پریس بدایون،

مولوی نظام الدین حسین مرحوم نظامی بدایونی سابق اڈیٹر ذو القرنین ہماری پرانی تہذیب کے ان یادگارون مین تھے جن کے نمونے اب ناپیدا ہون گے، ان کی ساری زندگی مسلمانون کی خاموش خدمت مین گذری، تعلیم سے ان کو خاص دلچسپی تھی، وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ممتاز رکن اور براونشل کانفرنس کے سکریٹری تھے، اور اس کے ذریعہ انھون نے نہ صرف تعلیمی بلکہ دوسری مفید خدمات بھی انجام دین، ان کا اخبار ذو القرنین تقریباً نصف صدی سے جاری ہے، ان کے نظامی پریس نے اردو زبان وادب کی بہت سی قابل قدر کتابین اور دیوان غالب، مراثی میرانیس اور مثنویات میر کے نہایت نفیس اڈیشن شائع کیے، مرحوم خود متعدد کتابون کے مصنف تھے، ان مین قاموس المشاہیر زیادہ اہم اور اپنے موضوع پر اردو مین پہلی کتاب ہے، اس مین ہر طبقہ کے نامور اور ممتاز اصحاب کمال اور علماء ومشاہیر کے حالات ہین، غرض مرحوم نے زندگی کے ہر شعبہ مین قابل تقلید نمونہ چھوڑا ہے اور ان کی زندگی نوجوانون کے لیے شمع راہ کا کام دے سکتی ہے، اس لیے جناب محمد احمد صاحب کاظمی نے ان کے سوانح لکھ کر ایک مفید خدمت انجام دی ہے، اس مین مرحوم کے خاندانی حالات انکی قومی ملکی اور علمی وتعلیمی خدمات اور ان کے اخلاق وسیرت کی تفصیل ہے، امید ہے قومی کارکنون کے حلقہ مین خصوصیت کے ساتھ اس کتاب کی قدردانی کی جائے گی۔

"م"

جلد ۶۳ ماہ شعبان المعظم ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۹ء عدد ۶

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۴۰۲-۴۰۴

مقالات

تدوین قرآن — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۴۰۵-۴۲۲

عہد اسلامی کا ہندوستان — جناب مولانا سید ریاست علی ندوی — ۴۲۳-۴۴۲

منصف سلاطین اسلام — جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین — ۴۴۳-۴۵۵

جماعت اخوان الصفا — جناب صغیر حسن صاحب معصومی ایم اے استاد شعبہ عربی واسلامیات ڈھاکہ یونیورسٹی — ۴۵۶-۴۶۸

مخطوطہ فتح المنان فی تائید مذہب النعمان — جناب مولوی ابو یحیی امام خان صاحب نوشہروی — ۴۶۹-۴۷۷

وفیات

سید حسین کی موت مین بعض غلطیون کی تصحیح — جناب بشیر الحق صاحب بیدل — ۴۷۸-

مطبوعات جدیدہ — "م" — ۴۷۹-۴۸۰